اسد محمد خاں
ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

-----۞۞۞۞۞۞۞۞۞-----

اسد محمد خاں 1932 میں بھوپال (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد 1950 میں پاکستان آ گئے۔ کچھ وقت لاہور میں رہنے کے بعد کراچی منتقل ہو گئے جہاں ملازمت کے دوران تعلیم مکمل کی۔ خاں صاحب کی تحریریں قریب قریب ادب کی سبھی اصناف میں موجود ہیں جن میں افسانے، شاعری، ریڈیو کے لیے خاکے، ٹیلی ویژن کے لیے سیریل، طویل دورانیے کے کھیل، گیت اور ملی نغمے شامل ہیں۔ ان کی اکیس کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے جو "The Harvest of Anger and other Stories" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔

اسد محمد خاں نے اپنے طویل ادبی سفر کے دوران متعدد ادبی ایوارڈ حاصل کیے جن میں پاکستان کا اعلیٰ سول ایوارڈ ''تمغۂ امتیاز'' (2009) بھی شامل ہے۔ اُن کی ایک کہانی ''ترلوچن'' برطانیہ کے اولیول کے نصاب میں بھی شامل رہی۔ وہ کراچی میں سکونت پذیر ہیں۔

اسد محمد خاں کی دوسری کتابیں

کہانیاں

- غصے کی نئی فصل
- کھڑکی بھر آسمان
- برجِ خموشاں
- نربدا اور دوسری کہانیاں
- تیسرے پہر کی کہانیاں
- اک ٹکڑا دھوپ کا
- The Harvest of Anger and other stories
(English Translation of Asad Muhammad Khan's 21 stories)

شاعری

- رکے ہوئے ساون

ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی

اسد محمد خاں

القا پبلیکیشنز
ریڈنگز کا اشاعتی ادارہ
لاہور

موجودہ ایڈیشن

القا پبلیکیشنز 2015

'القا پبلیکیشنز' اور 'ریڈنگز' الان وتال پرائیویٹ لمیٹڈ کے ذیلی ادارے ہیں۔

انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبر (ISBN)
978-9-69-947342-5

سرورق: فاطمہ سعید

خطاطی: نوری نستعلیق

طباعت
وارث پرنٹرز، سوہل سنگھ سٹریٹ، گوالمنڈی، لاہور

القا پبلیکیشنز

K-12، مین بلیوارڈ، گلبرگ 2، لاہور 54660
پاکستان

فون: 92 42 3575 7877
فیکس: 92 42 3575 5576
publications@readings.com.pk
www.readings.com.pk

نوائے طائرانِ آشیاں گُم کردہ آتی ہے

فہرست

'لا' کے بیان میں

برادرم! دعائیں۔

دو مصرعے سناتا ہوں تمہیں۔ بلکہ ڈیڑھ مصرع۔ ایک اردو کا، جو غالب نے کہا۔ دوسرا فارسی کا آدھا مصرع قرۃ العین طاہرہ کا کہا ہوا۔ یہاں ان دو بہت بڑے شاعروں نے آوازوں کو اتنا appropriate، اس قدر کھول کے، اتنا ڈوب کے بیان کیا ہے کہ خدا کی قسم، لفظوں میں بتائی گئی آوازیں کانوں میں سنائی دینے لگتی ہیں۔ بالکل صاف۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی وضاحت کے ساتھ۔ اس اردو مصرعے اور اس فارسی ٹکڑے کو سنانے میں پندرہ پندرہ بیس بیس بار لگا تار دہرا کے دیکھا ہے میں نے۔ جس جس طرح وہ شاعر اور وہ شاعرہ سنانا چاہتے ہوں گے، سنائی دینے لگتا ہے۔

تم سوچتے ہوگے ابھی تک بھائی کی تمہید چل رہی ہے۔

لو سنو۔ غالب کا مصرع ہے آشیاں گم کردہ طائروں کی آواز پر کہ:

نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے

اے بھائی! میں نے گم ہوئے ٹھکانوں اور رفیقوں کو تلاش کرتے پرندوں کی پکار سنی ہے۔ اللہ جانتا ہے یہ آواز دل نکال لیتی ہے۔

ایک نسبتاً چھوٹے شہر میں ہوش سنبھالا مگر دیہات نے میری حسیات کی تربیت کی ہے۔ یہاں بھی، وہاں بھی۔

یہاں منگھو پیر روڈ پر حسرت موہانی کالونی میں ایک جھگی میں رہتا تھا میں، اپنی ایک خالہ کے ساتھ۔ وہ بارشوں کے برس تھے۔ سال ستاون کہ چھپن ہوگا۔ بارش سیدھی جھگی میں چلی آتی تھی اور کیونکہ چٹائی کی چھت کے نیچے بھیگنے میں کوئی مزہ نہیں تھا؛ اس لیے میں اپنے ہاتھ کی بنائی میز پر، اپنی کتابوں کو اچھی طرح ترپال ڈھک کے، خود بھیگتا ہوا اور گاتا ہوا کالونی کے پیچھے والی marshy land میں نکل جاتا تھا۔ یہ دلدلی زمینیں؛ ویرانوں، ہرے میدانوں، کھائیوں، نالوں سے ہوتی اپنے سمندر تک پہنچ جاتی تھیں (جو بہت ہی قریب لگتا تھا کیونکہ اس وقت تو اپنے پچھواڑے کا ذاتی pond تھا سمندر)۔

وہاں تک اس راستے سے کبھی گیا تو نہیں میں؛ لیکن نمکین پانیوں کی مہک مجھے برابر بلاتی رہتی تھی۔ میں تین چار میل جا کر لوٹ آتا تھا۔ اچھی طرح شرابور اور بہت خوش۔

اس طرف آبادی کم ہی تھی کہ شاید تھی ہی نہیں۔ رستہ بھولے ہوئے آوارہ کتے اور گیدڑ اور لومڑی اور چڑیاں، کبھی کبھی کوئی اکیلا خرگوش، میلا مٹیالا سا، اور وہی بہت سی چڑیاں جن میں ٹیٹری، مینا، فاختہ، ہدہد سبھی ہوتے۔ میں نے انھیں بارشوں سے پہلے اور اس کے بعد دھوپ نکلنے پر نہال ہو ہو کے اپنے پر سکھاتے دیکھا ہے۔ یہاں اس mega-polis کے back waters میں۔

شہر کے وہ پرندے اور وہ بارشیں یاد ہیں مجھے۔ اپنی ڈاروں سے بچھڑی ہوئی مرغابیاں اور کونجیں جو آسمان میں سنسناتی ہوئی کُرلاتی اور کسی جانکاہ جدائی میں چیخ مارتی تھیں۔ یہاں نیچے لگتا تھا کہ کوئی دل مٹھی میں لے کے مسل رہا ہے۔

اور لڑکپن میں، میں نے اپنے تال کے کنارے بیتابی میں پکارتا ایک اکیلا ہنس دیکھا تھا۔ دو دن تک وہ چیختا رہا۔ آبی گھاسوں میں سے گزرتا، پانی پر نیچے نیچے اُڑتا، اتھلے جل میں ٹھیرتا، اُڈیکتا، پھر پکارتا ہوا وہ اُڑ جاتا۔ تیسرے دن وہ مر گیا۔ یا شاید مار دیا کسی نے۔ میں نے تال کے مچھیروں سے پوچھا، کہنے لگے کسی نے رحم کھا کے مار دیا ہوگا نہیں تو سنا ہے، ہنس سات سات دن لگا دیتا ہے۔

اپنے جوڑے کو یاد کر کے چیختا اور انگل انگل ڈوبتا ہے، پھر کہیں جا کے مرتا ہے۔ سارا جنگل بھر دیتا ہے اپنے دُکھ سے۔

طائرِ آشیاں گم کردہ

اس طرح کی آشیاں گمشدگی کو میں نے پچاس کی دہائی میں خود بھی جھیلا ہے۔ تو شاید اسی لیے اس آواز کو، اس اذیّے کو سمجھتا ہوں۔ اسی لیے اتنے برس اس پگھلتے پگھلاتے ہوئے مصرعے کو جان سے لگا کے رکھا ہے میں نے۔

اب وہ دوسرا مصرع... یا مصرعے کا جز وسنو۔ بڑی پر ہیبت فضا میں کہا گیا ہوگا وہ۔

غالب کا مصرع تو ایک گھلاوٹ کے ساتھ اپنی بات کہتا گزرا ہے۔ قرۃ العین طاہرہ کے لفظ ایک گہری اور بہت بھیانک Nothingness کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ نہ، نہ، اشارہ نہیں کرتے، بلاتے ہیں۔ ایک بالکل خالی، چیزوں سے اور آوازوں سے اور روشنی اور خیال کی دسترس سے دُور بالکل خالی کسی کائنات میں بلا رہے ہیں وہ لفظ۔ ایک ایسی جگہ جو کہ فی الحقیقت کوئی جگہ نہیں۔

یعنی یہ لفظ ایک لامکانی، لازمانی، بے وجودی سے اور معدوم وقت اور عدمِ وجود سے ہمارا تعارف کراتے ہیں، قرۃ العین طاہرہ کے یہ گنتی کے لفظ۔

پہلے تم پورا شعر سنو پھر اس ٹکڑے تک آنا اچھا لگے گا:

تو کہ فلس ماہی حیرتی چہ زنی ز بحر وجود دم
بنشیں چو طوطی و دمبدم بشنو خروش نہنگ لا

وجود کے اس بے کنار سمندر میں کیا کوئی دم مار سکے گا جو تو اپنے ہونے پر اصرار کرتا ہے اور کہے جاتا ہے کہ ہوں، میں ہوں۔ یہ سمجھ لے کہ عالم حیرت کی ڈولتی پھرتی حقیر سی کوئی مچھلی ہے جس کا گویا بے حیثیت فلس ہے تو (یعنی پوست یا scale) اس لیے بے عقل طوطی کی طرح چپ کر کے (جتنا بیٹھنا ملا ہے) اپنے ٹھیے پر بیٹھا رہ اور لحظہ لحظہ عدم کے (یعنی لا کے) monster کی دھاڑ سنتا جا۔ بھلا سن تو یہ دھاڑ ہر طرف سے سنائی دے رہی ہے (تو کیا ایسا نہیں ہے کہ یہ نہنگ تجھے اپنے شکم میں اُتار

بھی چکا...؟)

...دمبدم بشنو خروش نہنگ 'لا'۔ اس لیے بس یہ دھاڑ سنو جو عدم کی لازمانی، لامکانی، بے وجودی سے بے رکے چلی آ رہی ہے۔ جو کسی کو کبھی کبھی اور بعضوں کو برابر سنائی دی ہے۔ تو یہ واقفانِ حال کے لیے کیسی بھیانک بات ہے اور کیا بے آسرا پن ہے! (اپنے جون ایلیا نے بھی تو کہا ہے کہ: بہت بے آسرا پن ہے، سو چپ رہ)

قرۃالعین زریں تاج شاید وجود کے جوہر (Essence) کو تلاش کرنے والوں اور منبعے تک پہنچنے کی سعی کرنے والوں میں سے تھی۔ کیا خبر وہ کہیں تک پہنچ پائی یا نہیں۔ ہاں ''لا'' کی دہشت کو اس نے گنتی کے لفظوں میں ہم تک ضرور پہنچا دیا... کہ دم بہ دم بشنو خروش نہنگ لا۔

اس ٹکڑے کا ماحول خالص فکری ہے۔ یہ کسی مجرد مقصود (Abstract Quest) کی طرف اشارہ کرتا ہے (جسے ہرگز ہرگز میں سمجھنا نہیں چاہتا) یہ صوفیوں کا اور صاحبانِ حال کا مطلوب و مقصود ہے۔ میں تو حسیات کے حوالے سے چیزوں کو جانتا ہوں اور اس پر خوش ہوں۔ انھیں اسی طرح جانتے رہنا چاہتا ہوں میں۔ تجرید میں اترنے سے جی اُچاٹ ہو گیا ہے۔ تاہم اپنی حسیات کے حوالے سے ''لا'' کا ادراک میں نے بھی دو مرتبہ کیا ہے۔ ایک بار جب میں پندرہ سولہ برس کا تھا اور دوسری بار ابھی دو ہفتے پہلے، سن دو ہزار کے جون مہینے میں۔

پہلی بار میں اپنے سے بڑے کزن کے ساتھ جنگل میں بھٹکتا ہوا پندرہ بیس منٹ کو بالکل تنہا ہو گیا تھا۔ وہ کسی طرح کی physical دہشت نہیں تھی۔ نہ۔ ہرگز نہیں۔ وہ کٹیلوں کا خوف بھی نہیں تھا۔ (میرے پاس جنگل کی جانکاری اور ایک بھری ہوئی بندوق تھی۔) تو میں نے دیکھا کہ اچانک میرے آگے کچھ نہیں ہے۔ اس وقت Nothingness کے سامنے تھا میں۔ یہ ایسا تجربہ تھا کہ میں نے آگے کے درختوں کو اور آسمان کو اور جنگل کے بے رستہ فرش کو مٹتے، معدوم ہوتے دیکھا اور سناٹے کی ہونک ایک گرج کی طرح سنی۔ جیسے کٹیلے بے وجہ (brood کرتے ہوئے) ایک ہی بیچ پر گرجتے یا غراتے ہیں تو وہ کسی طرح کی مکمل بے آوازی کا آوازہ تھا۔ جتنی دیر تک میں اس Nothing کے روبرو رہا اس گرج کے سوا میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔ اپنے کزن کا پکارنا بھی نہ سن پایا میں۔ حالانکہ وہ کہیں

قریب ہی مجھے میرا نام لے کے پکار رہے تھے۔اس واقعے کے پچاس کہ باون برس بعد مجھے یہ دوسرا تجربہ ہوا:

دو ہفتے ہوئے کہ میں تین ملکوں اسپین، پرتگال، فرانس کے دس شہروں سے ہوتا ہوا گھر لوٹ رہا تھا۔ مجھے پیرس سے آنا تھا؛ جہاں 12 جون کو صبح دس پچپیس پر میری فلائٹ تھی؛ جس کے لیے حد سے حد 9:40 تک مجھے چارلس ڈیگال ایئرپورٹ ٹرمنل 2 پر پہنچ جانا تھا۔مگر مجھے سات منٹ کی دیر ہو گئی۔انھوں نے بورڈنگ کارڈ نہیں دیا اور مجھے رکنا پڑا۔ پھر 13 جون کو یعنی چوبیس گھنٹے بعد ہی مجھے فلائٹ مل سکی۔

لیکن میں جہاز چھوٹ جانے کی بات نہیں سنا رہا۔

...لو میں شروع سے سناتا ہوں۔

اسپین اور پرتگال کا دورہ ہمارے ''روزی رزگار'' کا حصہ تھا۔فرانس صرف داخلے کا ملک تھا۔ یورپی ملکوں کا ایک اتحاد ہے (شین زین) کہ آپ کسی ایک ملک کا ویزا لے لو اور بارہ چودہ ملکوں میں بناروک ٹوک، کسی سوال جواب کے بغیر، عافیت سے گھومتے اور آتے جاتے رہو۔تو ہم نے فرانس والوں سے ویزا مانگا۔ وہ مل گیا۔اسپین کے آٹھ شہر اور پرتگال کا شہر لزبن ہمارے کام کا حصہ تھے۔ پیرس مجھے محض اپنا ذاتی مسئلہ سمجھ کے دیکھنا تھا (ڈائرکٹر اور پروڈیوسر برسوں پہلے یہ شہر دیکھ چکے تھے)۔ مجھے یہاں شارلیمان اعظم اور شمپولیوں (وہ جس نے عہد فراعنہ کی تحریریں پڑھی تھیں) اور نپولین صاحبان کو اور وکٹر ہیوگو کو اور ڈاونچی کو خراج پیش کرنا تھا اور A Tale of Two Cities کو بھی۔ عمارتوں میں آئفل ناور دیکھنا تھا اور ناترے دیم کا گرجا گھر اور محراب فتح سے شروع کر کے شانزا ایلزے پہ ٹہل لگانی تھی اور ہمارے تمھارے ایک دوست کا اصرار تھا کہ جب جا ہی رہے ہیں تو بسم اللہ، پگال کا بیسواؤں کا محلہ بھی دیکھتے آیئے گا۔

تو یہ سب کچھ دیکھا۔ ہاں مونا لیزا سے نہ مل پائے۔اس روز نہ معلوم کیوں لوو میوزیم بند تھا۔

(11 جون سال دو ہزار! ہیہات! واویلا، واویلا، واویلا۔)

ڈائرکٹر اور میں تو اُس لیڈی کے احترام میں باقاعدہ سوٹ پہن کے گئے تھے (مزید واویلا)۔

خیر! پیرس کے مختصر قیام میں میترو کی زیرزمیں بھول بھلیوں میں پہلے ہم دونوں مارے مارے پھرے۔ پھر ہمارے پروڈیوسر بھی آن ملے تو تینوں نے فیصل آباد کے ایک پھیری والے لڑکے کو جو برسوں سے یہاں روزی کماتا ہے اور میترو کا ماہر چوہا ہے، ساتھ لیا اور کم وبیش وہ سب دیکھ لیا جو بیان کیا گیا اور پھر تھکے ہارے ہم سوا دو ڈھائی بجے اپنے ہوٹل پر آئے اور پڑ کے سو گئے۔ کوتاہی ہم سے یہ ہوئی کہ ہوٹل والے کو ہم نے یہ نہ لکھوادیا کہ ہمیں ساڑھے سات بجے جگا دینا۔ اگر لکھوا دیتے تو وہ نہ ہوتا جو ہوا۔

سوا آٹھ بجے پروڈیوسر نے ڈائریکٹر کو ہڑبڑا کے اٹھا دیا اور وہ خود پھر سو گئے۔ (یہ بندۂ عاجز تس پر بھی نہ اٹھا۔) آخر ڈائریکٹر نے واش روم سے نعرے مار مار کے اٹھایا تو میں نے بھاگم بھاگ اپنا سامان سمیٹا، شیو کیا، شاور لیا، نصیب میں جتنا ناشتا تھا وہ کیا اور ہوٹل کے دروازے تک جا کے انھیں خدا حافظ کہا۔ وہ ریل سے اپنے عزیزوں کے پاس فرینکفرٹ جا رہے تھے۔

ادھر پروڈیوسر نے اپنی محبت میں تقریباً کچھ بھی ناشتا نہ کرتے ہوئے مجھے ایئرپورٹ کی میترو پر سوار کرانے کی پیشکش کی۔ میں نے کچھ تکلف کیا پھر کہا کہ آیئے جزاک اللہ! ہم دونوں قریب ترین میترو اسٹیشن، گاردینارد کے (دو طبق نیچے) پلیٹ فارم 43 تک اترے۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور جذباتی ہوا۔ پروڈیوسر نے معانقہ کرتے ہوئے خدا حافظ کہا۔ (ہم ایشیائی مرد گھروں سے دور ہوتے ہیں تو زیادہ تر اپنی خالاؤں، پھوپھیوں کی طرح behave کرتے ہیں۔)
پروڈیوسر کو پون گھنٹے بعد وہ ریل پکڑنی تھی جو زیرزمیں سنسناتی ہوئی انگلش چینل پار کرے گی اور انھیں لندن پہنچا دے گی۔

میں اپنے سامان کے تینوں نگ دو پہیوں پر roll کرتا اور شانے پر لٹکائے خوش خوش میترو میں جا بیٹھا اور set ہو گیا۔ یہ گاڑی مجھے چارلس ڈیگال ہوائی اڈے پہنچانے والی تھی۔ آگے دبئی تھا پھر میرا شہر اور میرا گھر۔ بے شک یہ سب تھے مگر یہاں مجھ سے (یا میرے ساتھ میرے جہاں گرد میزبان سے) بڑی بھول ہو گئی تھی۔ یہ میترو بلاشبہ ہوائی اڈے جا رہی تھی (جو پورے چالیس میل دور ہے) مگر اس کی منزل ٹرمینل نمبر ایک تھی نہ کہ نمبر دو۔ ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ one اور two جانے والی گاڑیاں

alternately چلتی ہیں۔ اس لیے اب اگر مجھے two تک جانا ہے تو one پر بہرحال گاڑی بدلنی ہوگی اور مجھے کوئی چھ سات میل آگے جانا ہوگا۔ خیر! یہ سب لاعلمی کی برکتیں ہیں اور یہ کہ بندہ بشر ہر حال میں عاجز بلکہ جاہل ہے۔

تاہم اسی لاعلمی کے طفیل میں اس تجربے سے گزرا جو بیان کر رہا ہوں۔

زندگی میں دوسری بار میں نے Nothingness (یا Absolute؟) کا حسی تجربہ کیا۔ کوئی صوفی ہوتا تو کہتا کہ مجھے تجربہ کرایا گیا۔ مگر میں ایک عام سا Agnostic ہوں، اس لیے جو بھی کرتا ہوں خود اپنی ذمہ داری پر کرتا ہوں۔

تم سوچتے ہوگے یہ Absolute کہاں سے آ گیا؟ مجھے نہیں معلوم۔ بخدا نہیں معلوم کہ میں عدم کو Absolute اور vice-versa کیوں سمجھتا ہوں۔ یہ یقیناً وہی لاعلمی (یا بے علمی؟) ہے جس کا ذکر بار بار کیا جا رہا ہے۔

پچاس باون برس پہلے جنگل میں جو مجھے 'ناموجود' کی ایک جھلک دکھائی دی تھی، اے عزیز! وہ میں نے 12 جون کی صبح پھر دیکھی۔ اس بار میں زیرِ زمین، شاید دو تین طبق نیچے، میٹرو کے ایک اسٹیشن پر تھا۔ وہاں جس کیفیت سے میں گزرا وہ اس panic کی تقریباً بازگشت تھی جو برسوں پہلے جنگل میں کسی بھی میٹیریل چیز کو رُوبرو نہ پا کر میں نے محسوس کیا تھا۔ یہ کوئی روحانی واردات نہیں تھی۔ No Sir! خالص حسی تجربہ تھا یہ بھی۔

وہ غلط گاڑی جس پہ میں بیٹھ چکا تھا Terminal-1 کے اسٹاپ پہ جا رکی اور خالی ہوگئی۔ آگے کہیں اسی level پر ایک کاؤنٹر تھا جہاں ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے تھے۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی انھیں اپنا air ticket دکھایا۔

عورت بولی، ''دبئی؟... اوہ دبئی! یو گو تو ٹرمینل تو۔ داؤن اسٹے یرز فار نمبر تو... داؤن، داؤن اسٹے یرز... گڈ دے!''

''گڈ ڈے!'' میں نے بھی اسی تپاک سے کہا اور اس بی بی کی بتائی ہوئی سمت یعنی تحت الثریٰ میں اُتر گیا۔

یہ خودکار سیڑھی (ایسکے لیٹر) تھی جس نے مجھے اتارا۔

میں نیچے پہنچا۔

جہاں میں اکیلا تھا۔ بالکل، ایکدم قطعی اکیلا۔

ویسے وہاں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی بھی خالی تھی۔ کوئی انجن، اہلکار، مسافر، سامان... گاڑی میں کچھ نہیں تھا۔ بس خالی passenger carriages تھیں۔ ڈیڈ بوگیاں۔ اور سناٹا۔

''ہیلو!'' میں نے کہا۔

بازگشت آئی، ہےلو۔

میں پلیٹ فارم پر چل پڑا۔ دائیں طرف دور تک tunnel روشن تھی اور بے آواز تھی۔ بائیں طرف بھی اور زیادہ دور تک tunnel روشن اور بے آواز تھی۔

'داؤن استے یرز' کا یہ میٹرو اسٹیشن جہاں مجھے بھیجا گیا تھا بالکل خالی تھا۔ ایک دم dead۔

میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ اپنا baggage رول کرتا میں ایسکے لیٹر تک آیا جواب رُکا ہوا تھا۔ سامان کا بوجھ ہاتھوں پر سہارتا میں تیزی سے فولاد کی یہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اوپر — چالیس پینتالیس سیڑھی اوپر، وہ عورت کاؤنٹر پر بیٹھی تھی۔ میں نے اسے King`s English میں سمجھایا کہ وہ ایک ٹرین بیٹنگ ہے مگر وہ اصل میں ٹرین نہیں ہے۔ اور یہ کہ فی الحقیقت وہاں کچھ بھی نہیں ہے اس لیے کہ کوئی بھی نہیں ہے وہاں۔

عورت نے مسکرا کر کہا، ''ٹرمینل نمبر تو... ڈاؤن استے یرز!... گد دے!''

میں نے الجھ کے کہا'' گڈ ڈے! بٹ مے ام! وہاں کچھ نہیں ہے، نو ٹرین، نتھنگ۔''

عورت نے اپنی فرانسیسی میں کچھ کہا اور قطعیت کے ساتھ بولی، ''ڈاؤن استے یرز اینڈ گد بائی!''

میں نے سوچا یہ کہتی ہے تو پھر دیکھتا ہوں۔

پھر اترا۔ ایسکے لیٹر اس وقت بھی بند تھا، چالیس پینتالیس سیڑھیاں نیچے وہی سب کچھ تھا جو بیان کیا جا چکا ہے۔

اب کے میں دہشت اور جھونجھل میں مڑا اور غلط سیڑھی چڑھ گیا۔

یہ ایسکے لیٹر نہیں، عام marble سیڑھیاں تھیں اور مجھے زمین کے کسی اور طبق میں لیے جا رہی تھیں۔ میں مڑا اور سیڑھیاں اتر کے پھر اسی مردہ اسٹیشن پر آ گیا۔

خالی بوگیاں اور دور تک روشن اور بے آواز tunnel۔ اُس رخ پر بھی، اس رُخ پر بھی مطلق سکوت۔ سناٹا۔

تو یہاں لمحے بھر کو۔۔۔بس ایک ثانیے کو اپنے لڑکپن کے اُس سن سینتالیس اڑتالیس والے جنگل کی طرح میں نے ایک مردہ میٹرو اسٹیشن کو اور اُس کی تمام جزئیات کو اپنی آنکھوں کے سامنے معدوم ہوتے دیکھا اور وہ گرج سنی...'لا' کے monster کا وہ ہنکارا جو کانوں کے رستے ریڑھ کی ہڈی میں اتر جاتا ہے اور یہ دیکھا کہ اس دوران خالی ریل گاڑی، پٹریاں، روشنی، پلیٹ فارم۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

مگر میرا یہ تجربہ بہت ہی مختصر تھا۔

میں نے تیسری بار سیڑھیاں چڑھیں۔ اس بار بہت غصے میں۔ یہ اسٹیل کی سیڑھیاں تھیں۔ اوپر کاؤنٹر کی عورت جا چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک مہربان دکھائی دیتا نوجوان موجود تھا۔ جو بہر حال اس قدر انگریزی جانتا تھا کہ میں مطمئن ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ نیچے جو گاڑی کھڑی ہے وہ کچھ نہیں ہے۔ دوسرے پلیٹ فارم پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد گاڑیاں آتی ہیں، اور اُدھر...اس سمت میں چلی جاتی ہیں جدھر ٹرمینل 2 ہے۔ تم کسی بھی گاڑی پہ سوار ہو جاؤ، اگلا اسٹیشن ہر حال میں terminal two ہوگا۔ لوسنو! یہ تمھاری گاڑی کی آواز ہے۔ ہری اپ اور خدا حافظ!

میں گھوما تو وہ ایسکے لیٹر اب پھر کام کر رہا تھا۔ اب گویا پلک جھپکتے، میں اس زندہ گاڑی میں تھا، جس نے مجھے "ٹرمینل تو" تک پہنچایا جہاں معلوم ہوا کہ مجھے سات منٹ کی دیر ہو چکی ہے اور بورڈنگ کارڈ نہیں مل سکتا۔ خیر، وہ ایک الگ تجربہ، ایک الگ کہانی ہے۔

خدا حافظ۔ گویا پھر ملاقات رہے گی۔ تمھارا...

الکازر

عزیزم! سلامت باش۔

ہمارے شہر کا موسم سارے سال ایک سار ہتا ہے۔ موسم میں کوئی ڈراما نہیں ہے۔ بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھو تو دکھائی دیتی چیزوں میں بھی نیا، انوکھا کچھ نہیں۔ سیمنٹ کی بھیانک عمارتوں کے بیچ بیچ سے نظر آتا میلا، ملیالا، بھورا آسمان، جسے شہر کی چند لاکھ گاڑیوں نے پہلے سے تباہ کر رکھا ہے ویسے ہی برا لگتا ہے۔ میں کہتا ہوں، شٹ (shit)! بلکہ bullshit!

یہ اپنے شہر کے لیے سب وشتم نہیں۔ شاید ہر شہر (اصفہان اور بنگلور تک... جنھیں میں خوبصورت شہروں میں گنتا ہوں) جی ہاں ہر شہر سال کے کچھ حصوں میں اتنا ہی بے رنگ uneventful ہو جاتا ہوگا۔

میں بااصرار کہتا ہوں کہ میرا شہر بہت اچھا ہے۔ لیکن سال کے بیشتر حصے میں یہ visually یکساں اور بورنگ اور بے مایہ اور بے ماجرا نظر آتا ہے۔ اس بات سے میں کبھی کبھی بہت پریشان ہو جاتا ہوں۔ پھر دل کو سمجھاتا ہوں کہ یارا! شہر تو اپنا ہے۔ مانگے تانگے کا تو نہیں۔ شاید قصہ یہ ہے کہ بہت قریب سے اور بہرحال اور مسلسل اپنی محبوبہ کا رخ تاباں بھی دیکھتے رہو تو چھوٹے چھوٹے مہاسے، داغ دھبے، blemishes بے ضرورت رواں، اکا دُکا تل جو approved جگہ نہیں، فضول جگہ بھی ہو سکتا ہے (مثلاً ناک کی tip پر) تو اس غیر ضروری familiarity سے بیزاری اور contempt پیدا ہو سکتی

ہے۔ چاہت میں یہ خطرہ تو برابر ہے بھائی۔

پھر یہ ہے کہ باہر جاؤ تو یہ شہر یاد بھی آتا ہے۔ اس کا موسم تک یاد آتا ہے۔ مگر ایسا (باہر جانا) کم کم ہوتا ہے اس لیے اس کی یاد بھی کم کم آتی ہے۔ زیادہ تر تو ہم شہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گویا پتلیوں سے پتلیاں بھڑائے اسے گھورتے رہتے ہیں۔ یہ ہمیں گھورتا رہتا ہے۔ تو کیا ہم شہر سے اور شہر ہم سے اُوبنے لگا ہے؟

جو بھی ہو، میں یہاں کے موسم سے پریشان ہوں۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

پچھلے خط میں، میں نے یہاں کی برساتوں کا کچھ حال لکھا تھا۔ مگر وہ ایک نوجوان آدمی کی یادیں تھیں جسے صرف اپنی کتابوں کو بھیگنے سے بچانے کی فکر ہوتی تھی۔ اب میں وہ آدمی تو نہیں رہا، سن چھپن والا۔ اب اور بھی فکریں جان کو لگی ہوئی ہیں۔ بارش مجھے اُلجھا دیتی ہے۔ رستوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ پرانی عمارتیں گرنے لگتی ہیں۔ لوگ شہر کی ہر سڑک پہ خوار ہوتے ہیں۔ کھمبوں میں کرنٹ آ جاتا ہے۔ گرمی سارے سال پسینا پسینا رکھتی ہے اور سردی یہاں ہوتی نہیں۔

ویسے تم ان باتوں سے پریشان مت ہونا۔ کچھ خیال مت کرنا۔

یہ ایک پراگندہ ذہن آدمی کی worries ہیں (جو اب نوجوان بھی نہیں رہا)۔

جو شہر کا کچھ نہیں لگتا پھر بھی شہر کے اندیشے میں رہنے لگا ہے، خواہ مخواہ۔

یہ شاید چاہت ہے... اپنی زمین کے لیے۔

مگر دوستا! جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا، چاہت میں خطرے ہیں، مثلاً یہ کہ آدمی اپنے محبوب کی توصیف میں غلو کرتا ہے اور جھوٹا مشہور ہو جاتا ہے۔

یہ ایک پیمانہ ہو سکتا ہے چاہت کا۔

تاہم ایمانداری سے اور پیار سے مبالغہ کیا جائے تو سبھی معاف کر دیتے ہیں (بڑے سے بڑا شقی القلب Shimr-type بھی) بتاؤ کبھی کسی نے اصفہان نصف جہان والی کہاوت کو challange کیا؟ کبھی نہیں۔ بھائی یہ محبت ہے۔

میں نے 6 جون سن 2000ء کو غرناطہ کے آخری حکمرانوں آلِ نصر کی seat قصر الحمرا کو دیکھا۔

الحمرا کے بارے میں لکھتے ہوئے بیسویں صدی کے ایک اسپینی شاعر نے عجیب طرح کا کام کیا ہے۔ اس نے افسانوی فضا تیار کی ہے کہ جیسے الحمرا میں تین مختلف کردار ایک دوسرے کے روبرو ہوئے ہیں۔ ایک جمال پرست دانشمند (جو شاعر خود ہے) ایک بہت حسین عورت جو کہیں کی ملکہ ہوگی اور ایک فقیر نابینا۔ کبھی تو خیال ہوتا ہے کہ شاعر خود فقیر ہے اور وہ الف لیلوی عورت اس کا مقصود ہے کہ الحمرا میں ہوتے ہوئے وہ ہشیار ہر طرف سے آنکھ بند کیے بس اسی کا چہرہ تکے جاتا ہے اور کہتا ہے:

اے عورت! اسے خیرات دے۔ اس کم نصیب کی ناداری دیکھ کہ یہ الحمرا میں ہے اور نابینا ہے۔

("اسے خیرات دے، اسے بے نقاب ہو کے دیکھ..." استاد! مصرعے کا یہ استحصال کیسا ہے؟)

جب تک میں نے الحمرا میں Bu-Abdel (ابوعبداللہ) کا chamber نہیں دیکھا میں ان لائنوں کو محض چاہت اور مبالغہ سمجھتا رہا تھا۔ مگر نہیں میرے عزیز! سچ یہ ہے کہ 'جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جمیا ہی نہیں'۔ الحمرا کے سلسلے میں بھی یہ امر واقعہ ہے۔

بھائی! الحمرا کو محض دیکھنا ہی بصارت دینے والے کو tribute پیش کرنا ہے۔

مجھے اگر اسپینی tourism والوں کی طرف سے Granada کا بروشر لکھنے کا کام سونپا جاتا تو میں لکھتا کہ:

"Just glancing at Al-Hamra is celebrating the gift of Sight."

اللہ اللہ! بلکہ اللہ اکبر! (ایسے موقعوں پر میں سخت مومن ہو جاتا ہوں۔)

مزے کی بات سنو۔ ایک فرنچ لیڈی نے، جس سے ہم الحمرا میں ملے تھے — جو پیشے کے اعتبار سے سائیکیاٹرسٹ تھی، ہمیں بتایا کہ... مگر نہیں۔ نہیں نہیں، ایسے نہیں — میں اس خاتون سے تمھیں باقاعدہ ملاتا ہوں۔

یہ خاتون اپنے دولہا کے ساتھ الحمرا کے ٹکٹ کاؤنٹر پہ منڈلا رہی تھیں۔ ہم تینوں بھی اتنی ہی اداسی سے منڈلا رہے تھے کیونکہ ٹکٹوں کی فروخت sale for the day دوپہر ایک بجے بند ہو چکی تھی جبکہ ہم تینوں بھاگم بھاگ تین بجے کے بعد الحمرا پہنچے تھے (وہ فرنچ جوڑا وہاں سوا بجے سے چکر لگا

رہا تھا)۔ ہم کیا کرتے ، منھ لٹکا کے سایہ دار بنچوں پر بیٹھ گئے ۔ برابر کی بنچ اس جوڑے نے سنبھال لی۔ میاں، جو انگریزی بالکل نہیں جانتا تھا، عافیت سے اونگھنے لگا۔ خاتون نے خوش مزاجی سے پروڈیوسر سے ایک دو فقروں کا تبادلہ کیا پھر وہ اٹھ کے ٹہلنے لگیں۔

پروڈیوسر جلد مایوس ہونے والوں میں سے نہیں ہیں۔ وہ تو ہم بھی نہیں ؛ مگر دنوں کی تھکن اور tickets sold out کی تختی نے دھڑن تختہ کر دیا ہوگا اس لیے ہم دونوں بیزاری سے آدھی آنکھیں کھولے دنیا کو ٹہلتے ،اونگھتے اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے دیکھنے لگے۔

منھ ہی منھ میں وہ تیسرے آدمی، یعنی پروڈیوسر، بڑبڑا رہے تھے۔ وہ اپنی رواں سرائیکی میں کچھ ایسا کہہ رہے ہوں گے جس کا ترجمہ کیا جانا ضروری یا مناسب نہیں ہوگا اسی لیے انھوں نے اپنی آواز دھیمی رکھی تھی۔ ہاں گاہے گاہے وہ افریکن امیریکن (New Yorker) لہجے میں شی ی اٹ (یعنی کھینچ کے shit) کہہ رہے تھے۔ جس سے ان کی برہمی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا۔

ہمارے منھ لٹکانے اور غصہ کرنے کا سبب اور ہدف خود ہم تینوں ہی تھے۔ ہم ہی نے اسپین، پرتگال اور شہر پیرس کا یہ دیوانہ وار دورہ کسی مشورت کے بغیر پلان کیا تھا اور ایک ناگہانی بات سے پلان کا flat tyre ہو گیا تھا۔ تو اب ہم خود ہی کو مطعون کر رہے تھے۔ اس پلان میں ہم نے سہ پہر تین بجے سے رات دس بجے تک کا وقت الحمرا کو دیا تھا (نسل آدم کس قدر نادان اور بے عقل ہے)۔

الحمرا ہماری انگلیوں کے درمیان سے پھسل گیا تھا اور پروڈیوسر نے نیگرو لہجہ بنا کر زبردست طریقے سے ...!sheeit کہا تھا۔ اس لیے کہ:

نمبر ایک اسپین کی bullet train ’آوے‘ میں ہماری تین expensive سلیپر سیٹیں بک تھیں۔

نمبر دو اس آوے (AVE) کو آج ہی ساڑھے گیارہ بجے رات غرناطہ اسٹیشن چھوڑ دینا تھا۔ اسے ساری رات گولی کی رفتار سے چلتے ہوئے صبح آٹھ بجے دار الخلافے Madrid پہنچنا تھا، جہاں ایک صبا رفتار اونٹنی (گویا car جسے اپنے ایک ریٹائرڈ جی ڈی pilot چلانے والے تھے) ہماری منتظر تھی۔ یہ کار ہمیں اسپین کے دو شہروں سیگوویا اور سلامانکا لے جائے گی (سلامانکا University Town ہے، دس نہیں تو پانچ علی گڑھوں کے برابر) یہ فلسفی اونا مونو کا شہر ہے۔ اے رفیق! میں اس شہر پر دس

صفحے کا essay لکھ سکتا ہوں...جو بہر حال تشنہ ہوگا۔

آگے سنو: سلامانکا سے وہ کار ہمیں پرتگال کے دارالخلافے لزبن لے جائے گی جہاں ایک رات قیام کر کے اور لزبن پورٹ اتھارٹی سے ضروری معلومات حاصل کر کے اور حسبِ توفیق یہ شہر اور اس کا بندرگاہ کا علاقہ (جو ہماری کہانی کے رستے میں آئے گا) دیکھنے کے بعد؛ یعنی ایک دن، ایک رات اس شہر کو feel کرنے کے بعد، ہمیں اسی صبا رفتار اونٹنی پر سوار ہو کر تیسری بار میڈرڈ پہنچنا تھا پھر پورے trip کی سلوٹیں نکالنا اور خود کو واپسی کے اور پیرس شہر کے لیے تیار کرنا تھا—[واضح رہے کہ ہم Spain کے چار شہر قرطبہ، اشبیلیہ، مالقہ اور تورے مولینوس یعنی ٹاور آف دی مل پہلے ہی دیکھ چکے تھے]۔

مگر ہم نے الحمرا کو miss کر دیا تھا۔ یہ ہماری انگلیوں، اور Moors کی تاریخ کے بیچ سے صاف پھسل گیا تھا۔

ہمارے پروڈیوسر اٹھارہ برس سے نیویارک، LA، لاس ویگاس میں اور پیدا ہونے کے بعد سے یہاں اپنے ملتان شریف میں survive کر رہے ہیں۔ US کے تین مشکل شہروں اور اپنے پاکستان کے سب سے آسان شہر ملتان میں سروائیو کر جانے کے طفیل آدمی کو پکا ہو جانا چاہیے سو وہ پکے ہو چکے ہیں۔

چھ آٹھ بار shit کہنے کے بعد وہ اٹھے اور ٹکٹ کاؤنٹر پر ''ویلی'' بیٹھی لیڈی کے پاس پھر پہنچے۔ خوبصورتی سے مسکرا کے شاید چھٹی بار اس سے درخواست کی کہ ہم تینوں فنونِ لطیفہ اور ان سے متعلق مصروفیتوں کے لوگ ہیں، ہمارا حق عام tourists سے بڑھ کر ہے۔ از راہِ کرم کہیں سے ٹکٹ پیدا کرو، مولا تمھارے من کی مراد پوری کرے گا۔ لیڈی نے کہا، I'm sorry۔

وہ بولے کہ میری ماں عرب تھی۔ یہ یادگاریں میرے آبا و اجداد نے (Infact.. ننھیال والوں نے) تعمیر کی ہیں۔ میرا حق ان سب سے افضل ہے جو اندر جا چکے۔ یہ قصر اور پورا اندلوسیا میری legacy ہے۔ مجھے اور میرے دوستوں کو اندر جانے دو۔ پلیز مے ام! تین ٹکٹ میرے چیف ننھیالی صدام حسین کے نام پر عطا کرو۔ لیڈی نے ہنس کے کہا، I'm awfully sorry۔

پروڈیوسر نے کہا، ''اگر تمھاری اور میری انگلیوں کی زینت یہ انگوٹھیاں نہ ہوتیں تو میں ٹکٹوں

کے عوض تمھیں نکاح کی پیشکش کر سکتا تھا۔''

عورت شیشے کے پیچھے ہنستے ہنستے دُہری ہوگئی۔ بمشکل بولی، ''اب مجھے یقین آ گیا کہ تم part Arab ہو۔'' پھر سنجیدہ ہو کے بڑی دردمندی سے کہنے لگی، سنو میں تمھیں ایک مشورہ دیتی ہوں۔ تم اور تمھارے دوست اگر نو بجے رات تک انتظار کر سکتے ہو تو اس طرح شہر پناہ کے ساتھ ٹہل لگا کے فلاں دمدے اور فلاں برجی اور وہ والے الکازابہ (القصبہ) اور فلاں الکازر (القصر) کو دیکھ آؤ۔ ان پر کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔ شہر پناہ کے ساتھ پڑ رہنے یا ٹہل لگانے کی سنسنی کو ہم الف لیلہ کے اس کردار کے ساتھ share کر سکتے تھے کہ جس نے نصف شب کو فصیل سے ایک صندوق اترتے دیکھا تھا اور صندوق میں جھانکنے پر جسے ٹکڑے ٹکڑے کی گئی، یا بہت ہی گھایل ایک حسین عورت ملی تھی۔

شیشے کے پیچھے بیٹھی عورت نے یہ بھی کہا کہ موقع ملے تو gypsies کی بستی (ان میں سے بعض غاروں میں رہتے ہیں) میں بھی جانا، ان کے رقص فلےمینکو کا early show بھی دیکھ لینا اور حد سے حد سوا نو بجے تک لوٹ آنا۔ ہم ساڑھے نو سے (شاید) گیارہ بجے تک گنتی کے لوگوں کو خاص خاص ایوان دکھاتے ہیں (کہ جو الحمرا کا دل اور اس کی وجہ شہرت ہیں) تم یہاں سوا نو تک ہر حال میں آ جانا ــــ وقت پر نہ آئے تو پھر ہم ذمے دار نہیں ہوں گے۔ وما علینا الا البلاغ (معلوم ہوا دن میں روز آٹھ ہزار visitors داخل کیے جاتے ہیں، رات میں صرف پانسو)۔

خیر؛ ہم تینوں پھر سایہ دار بنچوں پر آ پسرے اور ادھ کھلی آنکھوں سے زیتون کی شاخوں کے بیچ سے نظر آتا آسمان دیکھنے لگے جسے (آسمان کو) الحمرا کی ایک سرسبز پہاڑی نے کاٹ چھانٹ کے کھڑکی جتنا کر دیا تھا۔

یہاں ہم ایک indolent کرب جمع (+) آسائش میں ٹانگیں پسارے پڑے تھے کہ فرنچ خاتون، جو برابر ٹہلے جا رہی تھیں، سامنے آ کھڑی ہوئیں، بولیں، ''تمھارے چہرے اس حقیقی مایوسی کو exaggerate کر رہے ہیں جو فی الاصل تم نے محسوس کی ہوگی۔ چکی کا یہ پاٹ جو تم پہنے ہوئے ہو اتنا بھاری نہیں ہے...No Sir!''

میں نے کہا، ''مے ام! ہم ایشیائی لمبے چہرے لے کر پیدا ہوتے ہیں یا شاید مایوسی کو show off

کرنا بھی ہمارے قسم کے exhibitionism میں شامل ہوگا۔"

بولیں، "تم لفظ لکھتے ہو بھائی! سنو۔ نکتے وکتے نکال کے بات کو گھمانے کی کوشش مت کرو۔ خیال رہے، میں پیشہ ورسائی کیاٹرسٹ ہوں۔او کے؟"

ڈائریکٹراور پروڈیوسر ہنسنے لگے، خاتون بولیں، "ہنستے کیا ہو؟ اصل قصہ بتاؤ کہ اب اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ جیسا کہ ابھی اس بے چین آدمی (اشارہ پ کی طرف) نے بتایا، الحمرا تم سے چھین نہیں لیا گیا۔ رات میں آ کے دیکھ لینا۔ ہاں؟"

ڈائریکٹر نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔اب آدھی آنکھیں کھول کے بولے، "اوں؟... ہاں! آپ ٹھیک کہہ رہی ہو۔God bless you۔"

پروڈیوسر کہنے لگے، "ہم tropics کے لوگ ہیں۔ ہماری محرومی کی نوعیت اور شدت کو سرد ملکوں میں رہنے والے پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اور ایک بات اور... ہمارا یہ رائٹر دوست ابھی یہ جھوٹ کہہ رہا تھا کہ ہم اس وقت مایوسی کا ناٹک کر رہے ہیں۔ ناں ناں مے ام! ہم اپنی مایوسی میں گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں... یقین کرو۔"

خاتون کہنے لگیں، "وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم یہ بات بہت خوش ہو کے کیوں کہہ رہے ہو؟"

پ بولے، "اپنے ان دوستوں کے برخلاف میں ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ میری پیدائش کے وقت ایک صوفی نے جو میری ولادت bless کرنے اور کانوں میں اذان دینے آیا تھا، عجیب بات کہی تھی (اذان والی بات میں پھر explain کروں گا)۔ مجھے—(دو گھنٹے کے بچے کو) مسکراتا دیکھ کے وہ مستی میں نعرے پہ نعرے مارتا تھا اور کہتا تھا کہ ہنسنے کی کون سی بات ہے بچے یا!؟ توں موج میلا کرنے ادھر نہیں آیا۔ جند جنجال میں گلے گلے پھنسنے آیا ہے، اوئے بھولے یا! یہ ہنسنے کی تھاں نہیں گریے کا مقام ہے۔"

سائی کیاٹرسٹ بولیں، "میں صوفی doctrines سے اور صوفیوں کے اس stance سے واقف ہوں۔ یا تو یہ window dressing ہے اور یہ گریہ وریہ سب extra charm سمجھا کے مارکیٹ کیا جاتا ہے، یا ایسی بات ہے جو مخالفوں نے مشرق کے صوفی myth کو زیادہ gray پینٹ کرنے کے لیے

پھیلا دی ہے۔ جو بھی ہو۔ میں نہیں اعتبار کرتی۔ تم لوگ رونے بسورنے کے اگر اتنے شوقین ہوتے تو ایسے ایسے قصر تعمیر نہ کرتے اور یوں شادیوں پہ شادیاں نہ کرتے۔''

میں نے کہا، ''خاتون! ہم نے الحمرا کے علاوہ تاج محل بھی تو بنایا ہے جو عمارت موت کو celebrate کرتی ہے۔''

بولیں، ''ناں ناں big brother۔ موت کو پیرانڈ celebrate کرتے ہوں گے۔ اگرچہ پٹی پٹائی بات ہے، مگر تاج love کو سلے بریٹ کرتا ہے۔ جی ہاں کارنل love کو۔ کسی Platonic love کو نہیں۔ ناں بھئی ناں۔ بڈروم پارٹنرشپ کو۔ جی ہاں، سیدھی سچی lovemaking کو جو فزیکل ہوتی ہے، اسے سلے بریٹ کرتا ہے، آئی سمجھ میں؟''

پروڈیوسر نے ہماری طرف دیکھ کے ماتھا پیٹ لیا۔ بولے، "Now Now Now. Here is a French person for you." پھر بولے، ''ہور چوپو!'' (یہ پنجابی محاورہ ہے یعنی اور چوسو! — مطلب اب بھگتو۔)

لیڈی ہاہا کر کے ہنسنے لگی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے دولہا بھی نیند میں مسکرائے۔

بات کارنل لو سے شادی بیاہ تک پہنچی، اس وقت پ نے انکشاف کیا کہ ان کی شادی کو بیس بائیس برس ہوئے ہیں (ان کی looks مجھے 'عمر چور' لگتی ہیں یعنی خود وہ 38 سے 42 تک کے لگتے ہیں)۔

میں نے بتایا میری شادی کو تقریباً 35 برس ہوئے ہیں۔ لیڈی نے پھر قہقہہ مارا اور بڑھ کے مجھ سے ہینڈ شیک کیا۔ بولیں، ''اور ہمیں 33 برس، ہاہاہا'' پھر اونگھتے ہوئے دولہے سے انھوں نے فرانسیسی میں بہت کچھ کہا۔ دولہے نے ہنستے ہوئے ہم تینوں سے کچھ کہا جو ظاہر ہے ہم نہ سمجھ پائے۔

سائی کیا ٹرسٹ خاتون بولیں، ''یہ بات میں ان سے کہلوانا چاہتی تھی۔ حضرات! آج ہماری تینتیسویں anniversary ہے اور اسی حساب سے ہم الحمرا آئے ہیں۔'' ہم تینوں اٹھ کے کھڑے ہو گئے اور ہم نے اپنے دوست کا لکھا، کمپوز کیا یہ گیت گایا:

''مبارک تمھیں، خوشی کا یہ ساں، مبارک مبارک، تمھیں یہ (پتا نہیں کیا)!''

دولہا صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے، انھوں نے اپنی کمر سے خم ہو کے ہمارا شکریہ ادا کیا۔

لیڈی اپنے دولہے پہ تصدق ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ شخص باقاعدہ handsome تھا، ماڈلوں، فلم ایکٹروں کی طرح (میں نے بیوی سے اس کے شوہر کے حسن جہاں سوز کی تعریف کی۔تس پہ وہ ہنستے ہنستے بنچ پر بیٹھ گئی۔)

بعد میں، میں نے الحمرا کے ایک الکازر کے back drop میں اس خوبصورت جوڑے کی تصویر کھینچی اور کہا،" آپ دونوں کو عمر عزیز کے بہترین تینتیس برس مبارک ہوں۔"

دونوں شکر گزاری میں ہم سے بغلگیر ہوئے اور وہاں الحمرا کے Court of Lions کے complex کے باہر ہم ان سے رخصت ہو گئے۔

مگر آگے چل کر ایک حیران کر دینے والے 'ایوان سفارت' میں ہمیں اس جوڑے سے پھر ایک بار ملنا تھا اور دو کینیڈینز سے (جن سے تین روز پہلے اشبیلیہ میں دریائے الکبیر کے کنارے ایک کمال ملاقات ہوئی تھی) خاص بوعبدل کے chamber میں ہمیں دوبارہ ٹکرانا تھا اور ایک شعر — ہمدم دیرینہ اور ملاقات مسیحا وخضر والا شعر — پڑھنا اور ترجمہ کر کے سنانا تھا۔

تو یہ سب ایوان سفارت کے بیان میں اگلے کسی رقعے میں آئے گا۔

بھائی میرے! بوعبدل کا "چیمبر آف ایمبے سے ڈرز"، جھنجھوڑ کے جگا دینے والے کسی خواب حیرت فزا کی طرح ابھی تک آنکھوں میں لشک رہا ہے، پتلیاں جلائے دیتا ہے۔ تو بس اب اللہ ہی اللہ ہے۔

باقی باقی۔ تمھارا۔

چُھٹکی بی بی سکینہ — تھوڑا فرانس اور اسپین

برادرم!

سفر کا حال کہیں سے بھی سنایا جا سکتا ہے۔

تو سنو، اسپین اور پرتگال کی روداد جہاں کی تہاں چھوڑتا ہوں اور پیرس کے شمالی دروازے گاردے نارد سے اس بے مثال شہر میں اپنا داخل ہونا بیان کرتا ہوں۔

انسانوں سے اُمڈتے چھلکتے اس میترو اسٹیشن کے کجلائے ہوئے فرش پر دنیا جہان کے لوگ کہیں نہ کہیں پہنچنے کو ہر سمت میں جھپٹ رہے تھے، آ جا رہے تھے یا ہماری طرح سامنے سامان کی ڈھیری بنائے کچھ دیر کو بنچوں پر ستانے لگے تھے۔

گورے، کالے، سانولے چہرے اور تانبے جیسے تمتمائے ہوئے بھی اور بعض باقاعدہ لال بھبھوکا، جیسے انار۔ تو انھی چہروں میں ہمیں ایک ہندی بی بی کی پریشان حال صورت دکھائی دی۔ اپنی طرف کے سیاہ بھنورا بال، blunt ناک اور خاصا سانولا رنگ۔ وہ اپنا چہرہ اٹھائے repeat fire میں پکارے جا رہی تھی، ''اتل! اتل! اے اے اتل! اے سنو تو... اتل!''

جو آدمی ان آوازوں پر مُڑ کا وہ اتنا ہی نوخیز تھا، جتنی یہ چھٹکی بی بی سکینہ (سکینہ کا لاحقہ میں نے خود لگا لیا ہے، اپنی آسانی کے لیے... کس لیے کہ وہ میاں بیوی مجھے سکینوں جیسے لگے تھے، یعنی جتنے

سکینے میں نے زندگی بھر میں دیکھے ہوں گے،ان جیسے)۔

بہت ہوئی تو وہ بیس برس کی ہوگی یا بائیس تیئیس کی۔

بلیو جینز کے ساتھ اسی کپڑے کی جیکٹ اور جوگرز پہنے وہ کبھی اپنا سفید فلو پی ہیٹ ہاتھ میں لے کے ریلوے گارڈز کی طرح زور زور سے ہلاتی، کبھی اسے اپنے سر پر مڑھ لیتی۔ میاں کو ہدایات دیتے ہوئے فلوپی اس کے ہاتھ میں آجاتا تھا جسے وہ stress کے لیے کبھی آتے جاتے اتل کی طرف ہوا میں hit کرتی، کبھی تازیانے کی طرح اپنے گھٹنے پر مارتی تھی، جیسے محرم کے جلوس میں خود پر کوڑے برسانے والے قلندر کرتے ہیں۔

وہ ایوریسٹ چڑھنے والے نیپالی قلیوں کی طرح اپنی بساط سے کہیں بڑا پشتارہ خود پر لادے شمالی اسٹیشن کے اس کھلے ہال میں تیزی سے گردش کر رہی تھی (animated فلموں میں دکھائی گئی محنتی چیونٹی، چھٹکی بی بی سکینہ)۔

''ہری اپ اتل! ہے ہے ہے... نوٹائم ٹو ویسٹ۔ ہے ہے اتل! پلیز اتل!''

مجھے وہ مینا لگی۔ بہت پرشور اور چنٹ — بلکہ آتش زیرپا۔ باپ رے باپ! لڑکیاں ایسی کب ہوتی ہیں۔ مگر وہ ایسی ہی تھی۔

پھر وہ بولی،'' O my!، کب بی ایسی مص ضیبت بن جاتا ہے، this rushing around۔'' وہ ٹھیک ٹھاک جھنجھلاہٹ میں بڑبڑائی تھی اور جس بنچ پر میں بیٹھا تھا اس کے ہتھے سے اپنا پشتارہ نکالنے کو دو قدم ریورس گیئر میں چلی تھی۔ اس نے اچھے ڈرائیور کی طرح سر گھما کے دیکھا تو میری اس کی نظریں ملیں، اخلاقاً بولی،''کیا کھیال ہے آپ کا؟... ہاں sir!؟''

میں نے جواب میں کہا،''اوں ہونک! کوئی مصیبت نہیں۔ اتل جیسے partner کے ساتھ، "It's always a pleasure" مجھے اپنی جیسی زبان بولتے پا کر اسے زیادہ اچنبھا نہیں ہوا تھا۔ ہاں جس طرح میں نے اتل کا نام لیا اور اس کے لیے کلمۂ خیر کہا، اس پر وہ ہنس پڑی،''تھینک یو!— thanks for the compliment...sir! — اتل میرا ہزبینڈ ہے۔''

میں نے کہا،''ظاہر ہے...صاف نظر آرہا ہے۔''

''آں؟'' لمحے بھر کو اس کی پتلیاں سکڑ گئیں مگر پھر وہ آنکھوں سمیت پورے چہرے سے ہنسی۔

''یہ compliment جرور میرے لیے ہوگا، I'm sure؟''

میں نے کہا۔ ''بیشک، دیکھیے نا، ینگ لیڈیز کو کبھی کبھی اپنی اتھارٹی استعمال بھی کرنی چاہیے... مطلب، استعمال کرتے نظر آنا چاہیے۔''

ہنستے ہوے بولی، ''یہی بات... and sir! "*istemal*" is a good word... آپ اردو والے ہیں نا؟'' وہ لفظ ''مسلم'' کہنا چاہتی ہوگی سو اس نے ''اردو والے'' کہا۔ مجھے اس کی یہ احتیاط اچھی لگی۔

''جی ہاں، اردو والا ہوں۔'' میں نے اپنا نام بتایا۔

''میں نندتا ہوں... نندتا somebody'' اس نے اپنا last name بتایا تھا جواب مجھے یاد نہیں آرہا (اسی لیے میں نے یہ سکینہ لگالیا)۔

لڑکی نے اپنے بارے میں اگلی جانکاری دی، کہنے لگی، ''ہم لوگ یوپی کے ہیں... اور آپ؟''

میں نے لمحے بھر رک کر کہا، ''مجھے مالوہ بندیل کھنڈ سے سمجھ لیجیے۔''

ساتھی ڈائریکٹر میرے برابر آن بیٹھے تھے۔ وہ خوبصورت کاغذ میں لپٹے جیم مکھن لگے گرما گرم ٹوسٹ لائے تھے۔

میں نے ان کا تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ آگرے سے ہیں۔

بہت سرشاری میں بولی، "Agra! what a place!"

اور ڈائریکٹر سے کہنے لگی، ''آپ لکی ہیں sir، کی آگرے میں جمے۔''

وہ بولے، ''yes indeed I am... آپ کا شکریہ lady۔ مگر مجھے آگرہ چھوڑے پینتیس چھتیس برس ہو گئے۔''

وہ نہیں سمجھی۔ میں نے کہا، ''جی ہاں میں نے بھی سن پچاس میں اپنی جگہ چھوڑ دی تھی... ویسے جاتا آتا رہتا ہوں۔ نو دس بار گیا ہوں۔''

اب بھی نہ سمجھی تو ڈائریکٹر نے بتایا کہ اصل میں ہم اپنے choice سے پاکستانی ہیں۔ کراچی

ہمارا شہر ہے،اس وقت ہم اپنے ملک سے یہاں ریکی کرنے آئے ہیں،اپنے ٹی وی سیریل کے لیے۔

"Ah,Ha" خوش ہوگئی، کیونکہ اس کا میاں ٹکٹیں اور نوٹ تھامے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا آ رہا تھا۔

اس نے ٹکٹ اور نوٹ سنبھالے، میاں کو بہت مسکرا کے دیکھا (جیسے لفافہ نکالنے پر طوطا فال والا خوش ہو کے طوطے کو دو دانے دال کے چگاتا ہے) پھر وہ ہمارا تعارف کراتے ہوئے میاں کو بتانے لگی، ''یہ ہمارے ادھر کے 'نے برڑ' ہیں—from Karachi—یہ صاب پہلے مالوے میں رہتے تھے اور یہ صاب آگرے میں۔ابی ادھر ٹی وی سیریل بنانے کو آئے ہیں۔''

میاں سکینہ نے ہمیں، ہمارے پروجیکٹ کو goodluck کہا اور بولا، "If you`ll excuse us"

پھر اس نے چھنکی پر بندھے پشتارے کے بند کھول کر اسے آزاد کیا اور خود وہ پشتارہ اپنے اوپر لاد، ایک ان دیکھی ڈور میں بندھا، بی بی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

چھنکی نے جاتے ہوئے لہک کے ہمیں، ہمارے پروجیکٹ کو دعا دی تھی۔

اب وہ آزاد پرندے کی طرح تھوڑا اڑتی، تھوڑا بھاگتی سامنے کے کھلے پلیٹ فارم پر چلی جا رہی تھی۔

یہاں سے آگے فرانس اور انگلستان کے ساحلوں کے بیچ میلوں تک پانی کی دسترس سے کہیں نیچے اسٹیل اور کانکریٹ کی وہ عظیم الشان سرنگ بچھی ہے جس میں سے ایک تیز رفتار گاڑی گزرے گی۔ یہ ریل گاڑی بہت کم وقت میں چھنکی اور اس کے میاں کو، اور سیکڑوں مسافروں کو ایک چھوٹے سے پرشکوہ جزیرے میں پہنچا دے گی جس پر برطانیہ عظمیٰ بسا ہوگا۔

مگر سکینوں سے ہماری یہ ملاقات اسپین اور پرتگال سے لوٹنے پر ہوئی تھی۔ اس وقت تک ہم اور بہت سے دلچسپ لوگوں سے مل چکے تھے۔

اسپین کے دارالخلافے مادرِد میں ہوائی اڈے پر ہمیں ایک دانشمند سکھ سردار فلاں سنگھ مان نظر آیا تھا۔

ہمیں پہلی بار پیرس میں کچھ ٹھہرنا تھا۔ نہ ہم فرانسیسی زبان سے واقف تھے نہ کسی یاری زیاں سے یاد اللہ تھی۔ بہت پریشانی میں بیٹھے تھے کہ اعلان ہوا اور پیرس سے مادرِد پہنچنے والی کسی پرواز کے

مسافر سامنے سے گزرنے لگے۔ مسافروں میں ایک شریف صورت سکھ دکھائی دیا۔ دل نے کہا، ہونہ ہو یہی فی الوقت ہمارے لیے خضر کا کام کر دکھائے گا۔ اٹھ کے سلام کیا۔ پوچھا پیرس شہر سے واقف ہو؟ ہنسا، کہنے لگا، ''اٹھاراں، وی برس سے ادھر ہی روجی کماتے ہیں۔ اس شہر کو خوب سمجھتے ہیں، دسو کی گل اے؟''

ہم نے اپنا مسئلہ بیان کیا اور یہ کہ ہم اس شہر سے اپنے لیے کیا چاہتے ہیں۔ اور بتایا کہ فرانس کی حد تک ہم بالکل اجنبی ہیں۔ پیرس میں کوئی جان پہچان نہیں۔ اپنے جنوبی ایشیائیوں کی صورتیں دکھائی دے جائیں گی تو کچھ حوصلہ ہوگا۔ چھتیس یا اڑتالیس گھنٹے اچھے کٹ جائیں گے۔ کچھ رہنمائی فرماؤ۔

سردار فلاں سنگھ مان پھر ہنسا، کہنے لگا، ''پیرس شہر کے شمالی پھاٹک، یعنی گار دے نارد سے داخل ہو گے تو پہلی ہی نظر میں شہر کا چہرہ مانوس لگے گا، کس لیے کہ اس مضاف میں اپنی طرف کے بندے بہت ہیں۔ پھر بولا کہ میرا اپنا ہوٹل مان سرائے نامی بھی اسی طرف ہے۔ آپ جاؤ گے تو فرنٹ آفس پہ ایک لڑکا سبرامنی نام کا میری نیابت کرتا ملے گا۔ آپ نام ہی سے سمجھ گئے ہو گے کہ کہاں کا اور کس طور کا ہوگا؟ یہ جنوبی ہند کا مدمغ قسم کا پڑھا کو بچہ ہے۔ وہیں کہیں فرانس میں کسی بات پر پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ ان دنوں چھٹی پر ہے، ایکسٹرا فرانک کمانے کو ادھر گلے پہ بیٹھ گیا ہے۔'' تو پاپا جی! آپ سبرامنی سے ہماری اس ملاقات کا ذکر کرنا، وہ آپ لوگ کو اچھی طرح set کرا دے گا۔ ایک بچے ملتانی نامی کو تمھارے ساتھ کر دے گا۔ یہ ملتانی آپ لوگ کو دو روج میں، دیکھنے جوگا پیرس، دکھا کے فارغ کرے گا۔ آرام سے جاؤ۔ پرواہ کوئی نئیں۔''

تو خیر، اے عزیز! اس سبرامنی اور ملتانی کا ذکر اذکار اتنا ہی ہو سکے گا۔ کس لیے کہ سردار فلاں سنگھ مان کا ہوٹل مان سرائے بہت ڈھونڈنے پر بھی ہمیں نہ مل سکا۔ ہاں اپنی طرف کا کوئی ضرور مل گیا۔ ایک ایرانی زرتشت بھائی سے فٹ پاتھ پر ملاقات ہوگئی۔ ہم نے انھی کے ''پان سیوں'' (Pension) میں ڈیرہ ڈال دیا۔

بھائی مبین مرزا! یہ پہلی کمک ہے جو مکالمے کے لیے روانہ کی جارہی ہے۔

یار زندہ صحبت باقی 23 جولائی 2001۔

☆

شہروں سے مانوس ہوتے کچھ وقت لگتا ہے۔

سب کے ساتھ یہی ہے۔

میرے ساتھ، البتہ، ایک سہولت ہے... یہ کہ میرا یہ' کچھ وقت' بہت مختصر ہوتا ہے۔ بس دو، ہی تین گھنٹے۔

میں کرتا یہ ہوں کہ قلبِ شہر میں جو بھی راستہ، محلہ، عمارت، بازار مجھے اچھا لگے، بہت leisurely اس کا ایک چکر لگاتا ہوں۔ پھر دوسرا اور تیسرا اور چوتھا۔ کسی نکڑ پہ رک کے اس کی آوازیں، روشنی اور سائے، اس کی رفتار، اس کی مہک... مطلب پورا اوتار دیکھتا، سنتا، سونگھتا ہوں اور ہاتھ لگا کے چھوتا ہوں۔ پھر یہ کرتا ہوں کہ پہلے کبھی کے دیکھے، سنے اور چھوے ہوئے کسی شہر، محلے، بازار اور جگہ سے اس ایک گوشے کو ملا کے، ساتھ رکھ کر دیکھتا اور اندر اتار لیتا ہوں۔ مگر خود کو یاد دلاتا رہتا ہوں کہ یہ جگہ جہاں میں اس وقت ہوں اس پہلے دیکھے اور برتے ہوئے شہر سے کچھ کچھ ملتی جلتی ضرور ہے، بالکل اس جیسی نہیں۔ اور یہ کہ میں نے خود اپنی سہولت کے لیے یہ موازنہ کیا ہے، شہر سے مانوس ہونے کو۔۔۔ اور یہ کہ میرا مقصد بس اتنا ہی ہے۔

کبھی دل ہی دل میں کہہ اٹھتا ہوں۔ اچھا، ندی کا یہ پل تو قصبے سیہور جیسا ہے۔ اوہو! ذرا دیکھنا کیا تھائی لینڈ کے کنچنا بوری کا سا پھیلاؤ نہیں لگتا؟ ندی میں پڑتا بھنور عین مین ویسا ہی ہے۔ وہی وحشی خوشبو کہ جیسے گیندے کے دس لاکھ پھول ایک ساتھ کھل اُٹھے ہوں۔

اُو! بازار؟ یہ کوئی میلہ لگا ہے؟ میلہ چراغاں۔ شالیمار باغ، لاہور۔

سن انیس سو پچاس۔

تو یہ سب کرتے ہوئے میں اس کوچے، محلے، بازار ندی کو اپنے قریب لے آتا ہوں۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹوں میں یہ جگہ خود اپنی شناخت کے نشانات بنا لے گی۔ میرے حواس پر اپنے فنگر پرنٹس چھوڑ دے گی۔ ڈھائی تین گھنٹے اس طرح گزر جائیں گے پھر یہ الگ اپنی فائل کھول لے گی ...بہت دن کے لیے۔

(میں نے ''بہت دن کے لیے'' کہا، ''ہمیشہ کے لیے'' کہنا چاہتا تھا مگر نہیں کہا۔)

اب اس لفظ ''ہمیشہ'' سے خوف آنے لگا ہے۔ گردوپیش کے اور اندر کے انہدام کو محسوس کرنے لگا ہوں، مثلاً یہ کہ یادداشت میں دراڑیں پڑتی جارہی ہیں...اس لیے۔ ڈرنے لگا ہوں۔

صوفیوں نے 'ہمیشگی' کو بہت احتیاط سے استعمال کیا ہے۔ وہ کبھی ہمیشگی کو صرف اپنے 'صاحب' سے منسوب کرتے ہیں۔

مولوی بھی یہی سب کرتا ہے لیکن نہ معلوم کیوں وہ (مولوی) جب اپنے خدا کے بارے میں کہتا کہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا تو اس کا لہجہ grudging سا ہو جاتا ہے۔ جیسے اسے (مولوی کو) یہ بات اچھی نہیں لگ رہی۔ بڑا صدمہ ہے اسے اس بات کا۔ وہ اسے قبول تو کر رہا ہے مگر مجبوری میں۔ جیسے حاکم کی حاکمیت کو کوئی دل پر پتھر رکھ کے تسلیم کرے، بالکل اسی طرح۔

پر صوفی اپنے 'صاحب' کی ہمیشگی کو اتنے چاؤ سے برتتا ہے، ایسے لاڈ سے اس کا ذکر کرتا ہے جیسے ماں اپنے کڑیل جوان بیٹے کی چال ڈھال، اس کے تیوروں کا بکھان کرے۔

وہ ہمیشگی کی کرسی پر 'صاحب' کے برابر جا بیٹھنے کا ہوس مند نہیں ہے۔ نہ، بالکل نہیں۔

مگر وہ دوسرا آدمی (وہ ملاں) برابر اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ Boss کو کرسی سے push کر دے۔ خود سنبھال لے یہ سارا کھٹ راگ۔

شاید اس کے تبختر نے — نہ جاننے والوں کے درمیان اس نے جو اپنا قامت نکالا ہے شاید اسی نے ملاں کو ایسا بنا دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تو 'ہمیشہ' کا لفظ اب میں بہت احتیاط سے برتنے لگا ہوں۔

جیسے میرا دوست جون ایلیا یقین کا لفظ برتنے میں محتاط ہے۔ وہ کہا کرتا ہے کہ بھائی سن! اس ایک لفظ 'شاید' کو تو کثرت سے استعمال کر۔ کس لیے کہ کوئی بھی چیز یقین سے کہے جانے کے لائق کب ہے؟ اور وہ کہتا ہے، بھائی سن! یہ لفظ 'شاید' جو ہے، یہ ایک مہذب لفظ ہے۔ اس میں یقین کی دھونس دھڑی اور تلنگا پن نہیں ہوتا۔ اشتباہ کا انکسار اور بھلمنسی ہوتی ہے۔

میں نے اپنی بہت سی تحریروں میں جون کا ذکر کیا ہے۔ شاید دو کہانیوں (''براوو! براوو!'' اور

''ڈزنگ'') میں تو وہ جیسے مرکزی کردار بن گیا ہے۔ پھر اور جگہ بھی۔ کسی رپورتاژ کسی جائزے میں، جہاں جی کرتا ہے میں اسے ڈال دیتا ہوں۔ جون ایلیا کو۔

آج تیس پینتیس برس ہوتے ہیں، امروہے کے ایک سنی بھائی نے مجھے ٹوکا بھی تھا کہ یہ کیا کرتے ہو؟ کیا یہ کسی قسم کی مرعوبیت ہے؟ آں؟... یہ ناں کیا کرو۔ لوگ نہ معلوم کیا سمجھیں گے۔ میں نے کہا تھا سمجھا کریں۔ تم بتاؤ، تم کیا سمجھتے ہو؟ تس پہ وہ سنی امروہوی چپ ہو گیا تھا۔ آج جو ذکر نکلا ہے تو انسب ہے کہ اصل بات بتا دی جائے۔

اصل میں جون مجھے original لگتا ہے۔

ہوسکتا ہے اس نے اپنا کریکٹر، اپنا سارا ڈراما امراء القیس سے یا اس سے بھی دور کسی عرب شاعر یا فیلسوف سے اٹھایا ہو۔ اگر ایسا ہے بھی تو کیا حرج ہے؟ ہم میں سے کوئی ایک بھی اس کردار کو جسے جون اپنی اصل زندگی میں ری کری ایٹ کر رہا ہے، کبھی نہیں جان سکے گا۔ اس لیے اسے اوریجنل ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جون ایلیا جھوٹ بولتا ہے (جو وہ اکثر بولتا ہے) تو فوراً پکڑا جاتا ہے۔ دور سے نظر آ جاتا ہے کہ اس وقت یہ مکر کر رہا ہے۔ اور یہ اچھی بات ہے۔

کوئی کیا کر لیتا اگر وہ کبھی کسی جھوٹ میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتا یا وہ مکر کر جاتا اور ہمیں پتا بھی نہ چلتا۔ یہ ہے سارا قصہ۔

گویا پہلی بات یہ کہ جون مجھے original لگتا ہے اور آخری بات یہ کہ وہ ہپوکریسی نہیں کرتا۔ بس۔

اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ بہت اچھا شاعر اور اردو کے شاعروں کے درمیان زبردست سوچنے والی مخلوق ہے۔ عمرش دراز... (وہ اگرچہ عمر میں مجھ سے چھ ماہ سے دو سال تک بڑا ہو گا)۔

میں چاہتا ہوں کہ ہر اچھا لکھنے والا، کوہ قاف کے دانشمند بوڑھوں کی طرح، ایک سو سال چھ ماہ سے ایک سو دو سال تک کی عمر پائے۔ ہاہاہا (laughter)

خیر، تو آگے سنیے! میٹرو اسٹیشن سے نکلتے ہی ہمیں ایک ادا مست درویش دکھائی دیا تھا۔ عمارت کی فراخ سیڑھیوں کے خاتمے پر ایک سروس lane تھی، جس سے آگے گرین بیلٹ، پھر شاہراہ

شروع ہوتی تھی، جہاں تارمیک پر paint سے لکیریں کھنچی تھیں اور ''رکو، چلو، آہستہ'' جیسی ہدایات درج تھیں اور شہروں کے شہر پیرس کا اصلی تے وڈا ٹریفک چلتا تھا۔

ہمارا یہ درویش سروس لین کے خاتمے اور گرین بیلٹ کے آغاز پر خود اپنی بنائی ہوئی no man's land میں چت پڑا تھا (یاد کیجیے منٹو صاحب کا ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'') اس 'ٹوبے' نے جینز اور Plush کے گودڑ اور اصل چمڑے کے فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ لیر لیر جینز اور موم کپڑ بن چکے پلش سے نظریں ہٹا کر ہم نے اس کے زردی کھنڈے چہرے کو دیکھا تو لگا یہ بزرگ فوت ہو چکا ہے... گویا صوفیوں کے لفظوں میں حقیقت اولیٰ سے جا ملا ہے اور کوئی دم میں بلدیہ کی گاڑیاں سائرن بجاتی پہنچنے والی ہیں۔ مگر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کسی قسم کے ٹریفک والنٹیئر نے (جس نے اپنی بیلٹ میں موبائل فون اڑس رکھا تھا) آگے بڑھ کے فوت ہوئے ''ٹوبے'' کے فل بوٹ پر بے دلی سے ٹھوکر ماری اور دھمکاتے ہوئے کچھ کہا۔ 'ٹوبے' نے (یا اس کے جینز اور پلش اور رئیل لیدر نے) کروٹ لے لی، سو وہ جواب تک شرقاً غرباً پڑا تھا، شمالاً جنوباً ہو گیا۔ (درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی)

سروس لین کو آتی جاتی گاڑیوں کے لیے اضافی چار فٹ مل گئے۔

گودڑ پوش کا زردی کھنڈا بے رونق چہرہ، اس کی سرخا سرخ ریش و زلف کے باوجود، اس تمام عرصے میں مردے کا چہرہ بنا رہا تھا۔ مجال ہے جو قسم کھانے کو بھی ذرا سا رنگ آیا ہو۔

ڈائریکٹر اور میں سامان اٹھائے گزر رہے تھے۔ لمحے بھر کو ہم ٹھٹکے۔ اس گورے سادھو کے درشن کو ہم نے اپنی گردنیں بڑھائی تھیں کہ اچانک ٹریفک والنٹیئر نے ہم سے پشتو میں کہا، ''زا، زا'' (یا یہ بات اس نے فرنچ میں کہی ہوگی)۔

ظاہر ہے، وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم سروس lane پر ٹھٹکیں اور چلتی ٹریفک میں خلل ڈالیں۔

ڈائریکٹر بولے، ''دیکھا آپ نے؟ یہ گھامڑ اسے نہیں ہٹاتا ہمیں 'زا، زا' کرتا ہے۔ ہو نہ ہو اس سے بھی بھتا لیتا ہوگا... بسرا کہیں کا!''

خیر، تو ہم نے 'پان سیوں' میں ڈیرا ڈال دیا۔

فرض کیجیے آپ نے جناح ٹرمینل سے نکل کر کراچی کے محلے سنگھو لین میں یا قائد آباد کے

پچھواڑے کسی بھول بھلیاں چوک میں خود کو پایا اور وہیں کے کسی 'پان سیون' میں بستر اکھول کے بیٹھے اور بعد ایک ساعت کے شاور لے، نئے کپڑے پہن، ٹہلنے کو نکل گئے۔ تو آپ ہی انصاف کیجیے اور دل پر ہاتھ رکھ کے بتائیے کہ آپ کتنا پیدل چل سکیں گے اور اس تمام مدت میں کون سا کراچی دریافت کر پائیں گے؟

ہم پیرس کے قائد آباد مضاف میں کوئی ڈیڑھ گھنٹا گھومے۔ ایک جگہ سرِراہ مناسب سا کیاسک (Kiosk یا گمٹھی) دیکھ رک گئے۔ کسی قسم کا برگر یا چکن بھرتا بنوایا، گرم گرم کھالیا اور وہی خدائی پسند کوک شوک پی کے اپنی دانست میں تازہ دم ہوئے۔ آگے چل پڑے۔

سڑکوں پہ چین نائی (پرانا مدراس) اور ٹمل دیشم کی بڑی بڑی دیسی شکلیں دکھائی دیں۔ ان کے نام کچھ بھی ہو سکتے تھے، یم یم، لیس ماعیل۔ یم، بی، چین ڈرن۔ یف، یے، نس ٹرن...کچھ بھی۔

ایک صاحب اشرف نامی ملے، اپنی طرف کے۔ انھوں نے ٹی وی کا سن کے دلچسپی ظاہر کی۔ تاہم میرا اور میرے ہدایتکار کا نام انھیں سنا ہوا سا نہ لگا تو اخلاقاً سر ہلا کے رہ گئے۔ اپنے دو دوستوں اسلم اور بشارت کا ذکر کرنے لگے جو بالترتیب لاہور اور پشاور کے ٹی وی سینٹروں میں فلور منیجر اور چیف الیکٹریشن تھے۔ کہنے لگے، ملیں تو میرا سلام کہیے اور بتائیے کہ فی الحال میری رہائش ''چوئی میراج'' صاحب کے ساتھ ہے جلد ہی کوئی پتا ٹھکانا صحیح ہو جائے تو بہ ذریعہ ڈاک مطلع کروں گا۔

ہم نے کہا، درست۔

وہ ''have a good time بائی صاب!'' کہہ کے ایک طرف روانہ ہوئے۔

ہم دونوں سوچ میں پڑ گئے تھے۔ اس شہر کو اگر ہم اپنے 'جنوبی ایشیائی حوالے' سے دریافت کرتے رہے تو ایسے ہی اوپر تلے کے اینٹی کلائی میکس کا سامنا ہوگا۔

اچھا ہوگا جو 'پان سیون' کی لابی میں ایرانی بھائی کا طباق چہرہ دیکھتے ہوئے یا کمرے میں ٹی وی پر فرانسیسی سنتے ہوئے ہم یہ باقی وقت گزار دیں اور جب آواز پڑے کہ آپ کا دوست پروڈیوسر مادرِد سے یہاں پہنچ گیا ہے اور نیچے لابی میں کرسیوں میزوں کے بیچ پھنسا بیٹھا ہے تو ایک اچھے کشادہ آرام دہ پنگوڑے جتنی 'وسیع وعریض' لفٹ میں بیٹھ کر ہم اسے لینے اتر جائیں۔

سوا اپنے ٹھکانے پر آ گئے۔ دونوں کافی دیر تک کمرے میں پڑے کروٹیں بدلتے اور ٹی وی پر فرانسیسی سنتے رہے، آخر تھک گئے تو ہدایتکار دوست نیچے پہنچے اور پروڈیوسر دوست کو ان کے موبائل پہ کھڑکھڑایا۔ واپس آ کے بتانے لگے کہ وہ ابھی وہیں مادرِد میں ہیں، تاہم اس وقت جہاز میں بیٹھے ہوئے ہیں اور انھوں نے فلائٹ نمبر بتا کر فون بند کر دیا ہے کیونکہ کیبن کرو نے انھیں فون کھولے دیکھ کر گھورنا شروع کر دیا تھا۔

پروڈیوسر کے پہنچنے میں ابھی خاصا وقت تھا۔ ہم دونوں نے طے کیا کہ اس مدت میں آرٹ میوزیم لوو (یا لوغ) دیکھ آتے ہیں کیونکہ پروڈیوسر دوست کا شروع سے یہی اصرار تھا۔ وہ اس وقت بھی جہاز میں بیٹھے کہہ رہے تھے کہ آپ لوگ آرٹ میوزیم وغیرہ دیکھ کے رکھ لو، باقی چیزیں ہم تینوں ساتھ دیکھیں گے۔

[وہ شاید جاندار کی شبیہہ بنانے (اور دیکھنے) کو غیر شرعی سمجھتے ہوں گے۔ مگر یہ فقہی مسئلہ ہے سو یہ بات یہیں ختم کر دینی چاہیے۔]

لیجیے صاحب! طے ہوا کہ کیونکہ کافی وقت ضائع ہو چکا ہے اس لیے فوراً لوو کی طرف رش کیا جائے۔

میں نے تیار ہوتے وہی پٹی پٹائی (کلیشے) بات دُہرائی اور ڈاونچی کے شاہکار مونالیزا کو دیکھنے کی خواہش کا اعادہ کیا۔ ہدایتکار بولے، ''ہاں بھائی جان! ضرور دیکھیں گے۔ دو بار پہلے بھی بیوی بچوں کے ساتھ ادھر آئے تھے۔ کبھی کچھ دیکھا، لوو نہ جا سکے۔ بال بچوں کو مصوری، بت تراشی سے اتنا کوئی خاص شغف نہیں، اس لیے خوفِ فسادِ خلق سے دل پہ پتھر رکھ لیا۔ آج انشاءاللہ دیکھیں گے۔'' میں نے کہا، جیتے رہیے۔

پھر ہم نے وہ عظیم الشان فیصلہ کیا جس کا پہلے کہیں ذکر آ چکا ہے کہ کیونکہ آدمی فانی ہے اور دو دن کی زندگانی میں ایک دو بار سے زیادہ مونالیزا کیا دیکھی جا سکتی ہے اس لیے ہم دونوں سلیقے سے جائیں گے، یعنی ایک مشہورِ زمانہ خاتون کی حاضری میں سوٹ پہن کے (اور نکٹائیاں جیب میں رکھ کے) جائیں گے۔

پان سیوں کے ایرانی مالک نے ایک چھپا ہوا کارڈ تھما دیا جس پر میترو کا نقشہ بنا تھا اور بہت سی

ٹورسٹ جگہوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ہماری آسانی کے لیے ایرانی بھائی نے لال پنسل سے ہمارا پورا route کھینچ دیا تھا۔

لو جی، اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ہم اس کے بتائے قریب ترین میترو اسٹیشن میں اُترے... اور حسبِ توفیق چکرا کے رہ گئے۔

معلوم ہوا کارڈ کی مدد سے اگر کہیں پہنچا جا سکتا ہے تو ہم پہنچ چکے۔

میترو اسٹیشن صحیح تھا، پلیٹ فارم تک صحیح تھا مگر ہم اتنے disoriented تھے کہ سمتوں کو حتیٰ کہ ہندسوں اور حرفوں کو بھی ٹھیک ڈی سائفر نہیں کر پا رہے تھے۔

بے شمار گاڑیاں آئیں اور شمالاً جنوباً یا شرقاً غرباً چلی گئیں۔

ہم دونوں بھائی ایشیائی کنفیوژن کی تصویر بنے کھڑے رہے۔ ہماری سانولی شکلیں، بلنٹ ناکیں دیکھ کر ہمارے ہی جیسے لوگوں کو ترس آیا ہوگا۔ تو دس بارہ برس کی ایک ساؤتھ انڈین حلیے بشرے کی بچی، ساڑھی بلاؤز اور بیندی والی دو چار عورتوں کے درمیان سے نکل کے آئی اور اس نے مدد کی پیش کش کی۔ بچی نے جو کچھ کہا اس میں لفظ ''موسیو'' کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔

ہم نے اس نیک طینت کو انگریزی میں بتایا کہ ہم کیا ارادے لے کے نکلے ہیں، کہاں جانا چاہتے ہیں۔

یہ بات ہم یونانی زبان میں کہتے تو بھی وہی ہوتا جو ہوا۔ بچی ایک لفظ نہ سمجھی۔ وہ اور اس کے ساتھ والے ہندی، اردو، ہندوستانی کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم دس منٹ کی بات چیت اور ایرانی بھائی کا کارڈ لہرانے کا ایک فائدہ ہوا۔ دوبارہ معلوم ہو گیا کہ ہم صحیح جگہ آئے ہیں اور یہ کہ نیک طینت بچی اور ساتھ والیاں اسی سمت میں جا رہی ہیں۔

اس بات نے بڑا حوصلہ دیا۔

ایک گاڑی آئی۔ وہ لوگ بیٹھنے لگے، ہم بھی بیٹھ گئے۔

گاڑی چلی تو ہم نے اپنی منزل کے بارے میں بتانا پھر ضروری سمجھا۔ اور پھر سے آرٹ میوزیم اور لوو اور مونالیزا کی تکرار شروع کر دی۔ برابر کے لوگ بھی، جن میں گورے، کالے، سانولے سبھی

تھے، دلچسپی لینے لگے۔ تاہم انگریزی زبان سے بھی نابلد تھے۔

جب ہم دونوں آرٹ میوزیم "لوؤ" (اور احتیاطاً "لوغ") کہتے کہتے تھک گئے اور کوئی نہ سمجھا تو ڈائریکٹر دوست آگے بڑھے، بچی کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے، دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے۔ پھر انھوں نے ایک (گزارے لائق) لافانی مسکراہٹ اپنے چہرے پر لا کر بچی کی طرف دیکھا۔

وہ performing arts کے آدمی ہیں۔ اپنے میڈیم سے مدد لیتے ہوئے مونا لیزا بن کے دکھا رہے تھے۔

مگر اب اور ہی تماشا ہوا۔ بچی سمجھی وہ اسے خوش کرنے کو کسی قسم کا مسخرا پن کر رہے ہیں۔ وہ ہنسنے لگی۔ دو تین مسافروں نے بھی ساتھ دیا۔ ڈائریکٹر بھی ہنسنے لگے۔ پر انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ سب کو ٹھیرو ٹھیرو کا اشارہ کیا۔ پھر mime کرتے ہوئے مصور ڈاوِنچی بنے، اشارے سے بدن پر موزے جیسا پھنسا ہوا پتلون، ڈھیلا ڈھالا شلوکا اور کان کی طرف جھکتی ہوئی بڑی سی بیرے کیپ پہنی (جس کے بیچوں بیچ پھندنا لگانے کی انگل بھر ڈنڈی بھی تھی) پھر انھوں نے دائیں ہاتھ میں ایک خیالی برش تھاما اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں رنگوں کا خیالی پے لیٹ پہن کر اپنے سامنے ہوا کے canvas پر مونا لیزا paint کرنے لگے۔ پینٹ کرتے کرتے انھوں نے حاضرین کی طرف دیکھا اور بہت پیار سے کہا، "مونا لیزا۔" وہ ایک بار پھر اپنے چہرے پر اس کی لافانی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

ایک افریکن بھائی جو دیر سے منھ کھولے بیٹھا انھیں تکے جا رہا تھا، بے اختیار چیخ پڑا۔ اس نے حاضرین سے کچھ کہا اور بچی کو بتا دیا کہ ہم کہاں جانا چاہتے ہیں۔

بچی کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اس نے "اوو" سے ملتی جلتی کوئی آواز نکالی، پھر وہ سیٹ سے اٹھی اور زبردست کنٹری اور ہاتھوں کے اشاروں سے بوگی کے کارنس پر بنے میٹرو کے نقشے پر کچھ سمجھانے لگی۔

بچے کہیں کے بھی ہوں eloquent ہوتے ہیں، اپنی بات سمجھانا جانتے ہیں۔

ہم سمجھ گئے کہ ابھی ایک اسٹیشن آئے گا جس پر ہم ہلیں گے تک نہیں، بیٹھے رہیں گے۔ اس کے بعد آرٹ میوزیم کا اسٹیشن ہے۔ ہمیں وہاں اتر جانا ہوگا (بچی اور اس کے لوگ اپنا سفر جاری رکھیں گے)۔

یہ سب کرکے وہ بیٹھ گئی اور پھر اس نے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا، یعنی ہم سے کہا کہ دیکھو، پھر سامنے کی ہوا میں اس نے اپنا canvas کھینچا جس پر وہ بڑے وقار کے ساتھ گود میں ہاتھ رکھ لیڈی مونالیزا بن بیٹھی اور پھر وہ ـــ بہت ہی سانولی لڑکی ـــ خدا اسے سلامت رکھے، angelic smile میں مسکرانے لگی۔

ہم دونوں نے اور ساتھ کے مسافروں نے تالیاں بجا کر اس کا آدر کیا۔

ہمارے زمانۂ طالب علمی میں آٹھویں کلاس سے فارسی، عربی، سنسکرت کی باقاعدہ پڑھائی شروع ہوتی تھی۔ یہ اختیاری مضامین تھے، کوئی ایک ضرور لینا ہوتا تھا۔ جنھیں یہ سب اچھا نہ لگتا ہوگا ان کے لیے ڈرائنگ تھی اور جو بہت ہی انوکھے تھے ان کو اڈوانسڈ انگلش پڑھائی جاتی تھی۔

میں انوکھا نہیں تھا مگر انگلش لینا چاہتا تھا۔

بے تکلف دوستوں اور بھائیوں میں سے ایک نے مذاق اڑایا، کہا، انگریز کو ہم گھر بھیجنے کی سوچ رہے ہیں، انگلش لینگویج کی ہاٹ اٹھنے والی ہے تم اب اڈوانسڈ پڑھ رہے ہو۔ کیا قصہ ہے؟ میں نے کہا، پھیلی ہوئی زبان ہے دنیا سمجھ میں آنے لگے گی۔ بھائی بولا، فضول بات! تمھارا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ ''تم'' دنیا کی سمجھ میں آنے لگو، ہاہاہا!

خیر!

سب نے ڈرائنگ کے سلسلے میں دلیل دی کہ ابا ڈرائنگ کے استاد ہیں، ٹھیک ٹھاک سکھا چکے ہیں اور بھی مفت میں سیکھ لوگے اور عربی کا یہ ہے کہ قرآن شریف تو پڑھتے ہی ہو، مارے پیٹے اور پڑھ لوگے۔ اس لیے بھائی! فارسی لو۔ فارسی شاندار زبان ہے۔ میں آزمائشی طور پر فارسی کی کلاس میں جا جا کے بیٹھنے لگا۔

فارسی کے استاد شعر کہتے تھے۔ سبق پڑھانے، گردانیں کرانے کے بعد ہمیں مزے مزے کے فارسی شعر سناتے اور تشریح کرتے، کبھی لڑکوں سے بھی تشریح کو کہتے تھے۔ ہر بار دس پندرہ منٹ کی یہ چٹکلے بازی ضرور ہوتی تھی۔ کبھی کوئی لفظ، کوئی ترکیب سمجھاتے اور سب کو انوالو کر لیتے۔ ایک بار

ایک بہت بکی لڑکے کو 'پنبہ در دہن' کرنے کی دھمکی دے کر باقی کلاس سے کہنے لگے، ''یہ اگر باز نہ آیا تو آسان لفظوں میں بتاؤ کہ میں اس کے ساتھ کیا کروں گا؟''

بڑے بڑے تماشے کے جواب آئے۔

ایک بار شعر سنایا:

کشتۂ عشقم و آں نیست کہ در شہر کسے
نخلِ تابوتِ مرا بیند و شیون نکند

نخلِ تابوت پر سوالات کیے گئے۔ استاد نے کہا، لفظی معنی تم جانتے ہو، تفصیل میں ابھی نہیں بتاتا، خود معنی نکالنے کی کوشش کرو۔

ہمارا ایک ہم سبق دین دیال سکینہ (پھر سکینہ!) پولیس انسپکٹر کا بیٹا تھا۔ اپنے شوق سے اڈوانسڈ اردو پڑھتا تھا، وہ بھی میری طرح آزمائشی طور پر فارسی کی کلاس میں آنے لگا۔ بڑا 'فتین' تھا۔ غالب کے شعر، یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب ...کی تشریح اس طرح کرتا تھا کہ اے غالب تو جو تصوف کے مسائل حل کرتا رہتا ہے اور رمضان شریف میں ''ترابیاں'' پڑھتا ہے تو...الخ۔

لطف کی بات یہ تھی کہ نہ صرف غیر مسلم classmates کو بلکہ مومنوں کو بھی ظالم اسی طرح پڑھت کر کے قائل کر لیا کرتا تھا، پھر جب بات کھلتی تو ہنستا اور پٹائی کے خوف سے چھپا چھپا پھرتا تھا۔

تو دین دیال سکینہ نے اور میں نے نخلِ تابوت والے شعر کی تشریح کی۔

وہ بتانے لگا کہ مسلمان بنکروں (بافندوں) کے محلے سے گزرتے ایک بار اس نے یہ دیکھا کہ تابوت کے آگے آگے ایک آدمی کھجور کا جھاڑ لے کے چل رہا ہے، یہی نخلِ تابوت ہوتا ہے۔ قبر پر لگانے یا مردے پہ سایہ کرنے کو ہوتا ہوگا۔ شعر کا مطلب ہے کہ میں عشق کا مارا ہوں ـــ وہ بنکر بھی ایسا ہی ہوگا ہاہاہا ـــ تو بس لوگ دور سے کھجور پام دیکھ کے رونے لگتے ہیں کہ لو بیچارہ بنکر ـــ مطلب عاشق مارا گیا۔

میں نے کہا تم کانستھ اور لاعلم ہو۔ مسلمانوں کے مردے میں نے زیادہ دیکھے ہیں، تابوت

کے آگے آج تک کوئی جھاڑ واڑ چلتا ہوا نہیں دیکھا۔ بکواس ہے یہ!

کہنے لگا، یہاں کے مسلمانوں میں عشق کے مارے کم ہوتے ہوں گے۔ کچھ دن صبر کرلو، کبھی دیکھ لوگے۔

خیر، میں نے اپنے حساب سے تشریح کی۔ کہا کہ آسان شعر ہے، بعض باتوں کی وضاحت کے لیے تاریخ و جغرافیہ سے مدد لینی پڑے گی۔ شاعر جانتا ہے کہ پرانے ریڈ انڈین اپنے مردوں کو درخت پر دفن کرتے تھے، یعنی مردے کی گٹھری کو خوب اونچے درخت پر، جو نخلِ تابوت کہلاتا تھا، باندھ کر چھوڑ آتے تھے۔ متوفی چار چھ مہینے میں سوکھ جاتا تھا۔ تو شاعر کہہ رہا ہے کہ شہر کے لوگوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو مجھے نخلِ تابوت پر بندھا دیکھ کر نالہ و شیون نہ کرتا ہو۔ ہاہاہا!

وہ عجیب دن اور عجیب جگہ تھی۔ ہم موت پر اور تابوتوں جیسے morbid objects پر بھی کھل کے ہنس سکتے تھے۔

مگر نہیں۔ یہ زمانہ بھی خوب ہے اور جون دو ہزار کا پیرس بھی خوب تھا۔ تابوتوں وغیرہ پر اب بھی ہنسا جا سکتا ہے۔

ہم دونوں، ہدایتکار دوست اور میں، پیرس کے لوو میوزیم سے ناکام و نامراد نکلے اور سڑک پار کر کے ایک پتھر جڑے وسیع و عریض میدان میں آ کھڑے ہوئے۔ ابھی گرد و پیش کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ رولر اسکیٹنگ کرتے چھوٹے بڑے بچوں اور تماشا دیکھتے لوگوں کے درمیان ایک خلا پیدا ہوا جس میں سنہری کفن میں لپٹا خالص سونے کا مکھوٹا چڑھائے، اپنے پانچ ہزار برس پرانے تابوت میں کھڑا فرعون توتن خامن (عربوں کا طوطنخ عمون) ہماری طرف دیکھ کے ڈگمگایا اور تعظیماً جھکا۔ اتنا گہرا جھکا کہ لگتا تھا توازن کھو بیٹھے گا اور منہ کے بل آ رہے گا۔ مگر روباٹ کی طرح ڈگمگاتا وہ دوبارہ سرو قد ہوا، لمحے بھر کو لرزا پھر ساکت ہو گیا۔

لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ اصل میں انھی میں سے کسی نے اس کے تابوت میں ایک نوٹ پھینکا تھا جس کی شکرگزاری توتن خامن پر لازم تھی۔ اسے دیکھ کے ہدایتکار دوست خوب ہنسے، بولے، ''نسروں نے کیا مٹی پلید کی ہے فرعون کی۔ اچھا ہے، ہر فرعونے را پیرس۔''

ہدایتکار ٹیکنالجی کے آدمی ہیں۔ تو تن خامن کے اوپر تلے کا جائزہ لے کے بولے، ''خوب روبات بنایا ہے!'' پھر ٹھہر کے کہنے لگے، ''کمال ہے صاحب!''

میں نے کہا، جی نہیں، robot نہیں ہے، وہ تو بہت ایکسپنسو مشین ہوتی ہے، اسے اس طرح سڑکوں پہ دو دو چار چار فرانک کمانے کے لیے نہیں بھیج سکتے۔ یہ پیرس کا کوئی بے روزگار (sorry برسرکار) موالی ہے جو کفنی کھوٹے میں لپٹا اپنی دہاڑی لگا رہا ہے۔ یہ تھک جائے گا یا مر جائے گا تو دوسرا آ جائے گا۔

ہم یہ سب فنکاری اسپین کے شہر مالگا میں دیکھ کے آ رہے تھے۔ انھیں یاد دلایا کہ فلاں پلازا ڈی سول یا اس جامع کیتھڈرل (جیسے جامع مسجد ہوتی ہے) کے بازارِ طلسم فروشاں (یعنی تعویذ فروشاں) میں انگوری روپہلی رنگ کے صندوق پہ موسمِ بہار کی بیلوں میں لپٹا ہوا جو خوب روشن یسوع مسیح کھڑا تھا، کیا وہ نہیں دیکھا آپ نے؟

وہ بولے، ''نہیں۔ بھئی کیسے دیکھتے... ہم تو آپ کا جیبی 'آئی وا' ٹیپ ریکارڈر اور واک مین بدلی کرنے اندر گلیوں میں گئے ہوئے تھے۔ سندھی ہندو کی دکان پہ۔''

میں نے کہا، ''ہاں یاد آیا۔ جیتے رہیے۔ وہ بڑا کام کیا ہے آپ نے۔''

موسمِ بہار کی بیلوں میں لپٹے اس خوب روشن یسوع کو میں نے 'یسوعِ بہار' کا نام دیا ہے۔

مجھے نہیں معلوم وہ کسی مقامی سینٹ کا یا حواریوں میں سے کسی کا impersonation تھا یا اس کے ذریعے انھوں نے جنابِ مسیح کے قلبِ مطمئنہ کو روشنی اور بہار کی علامتوں میں interpret کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

مجھے تو اس impersonation نے حد درجے متاثر کیا۔ جی کرتا تھا، اس ہرے بھرے پیا کے جیے کو بڑھ کے بوسہ دو، اس کی آرادھنا کرو۔

دیکھا آپ نے، شبیہ بنانے اور تمثیل کرنے میں کیسے کیسے خطرات ہیں۔ مگر یہ معتقدات اور ادیان سے متعلق مباحث ہیں...not my cup of tea۔

میں تو اس وقت اس بہت بڑے آدمی، یسوع ناصری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یسوع، کچے

ارغوانی رنگ کے کھردرے ٹاٹ میں لپٹے ہوئے۔ ہتھیلیوں اور پیروں کے پنجوں میں زنگ آلود، کند میخیں ٹھکی ہوئیں۔ شکم پر، جس طرف آدمی کی تلی ہوتی ہے، اُدھر برچھی کا ایک گھاؤ جس سے ہرا بائل اور خون اور پانی رستا ہوا۔ یہ ہیں یسوع ناصری — ریاضت سے دُبلائے ہوئے اس بدن کے ساتھ کہ جس بدن کو، بہت مارا پیٹا، scourge کیا گیا، خوب ستایا گیا۔

یسوع، گہری گمبھیر مگر ریشم کی سی سوچ میں ڈوبے، سب سہتے، سب کچھ معاف کرتے ہوئے۔ اپنے پیروکاروں کے بڑے بڑے بھیانک کرتوت (نوعِ آدم کے سارے گناہ؟) اپنی جان پہ لیتے، میمنے کی طرح معصوم، کانٹوں کا تاج پہنے، ''جی زز۔ نیزارے نس۔ ریکس۔ جوڈیورم۔''

یہ عبارت ایک تختی پر خباثت اور استہزا کے ساتھ لکھی گئی کہ یہ ناصرہ گاؤں کا (نجار) یسوع، یہودیوں کا بادشاہ ہے۔

بھائی! یہ صبر و رضا کی شاید پرفیکٹ امیج ہوسکتی ہے۔ تاہم وہ آدمی تھے، آخر آخر آدمی۔ انھوں نے شکوے جیسی بس ایک بات کہہ ہی دی کہ الٰہا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟

دیکھا آپ نے، یہاں آدمی کلام کر رہا ہے:

Man forsaken (or betrayed?) by his God...

ارض و سما سنو سنو گرمِ 'فغاں' ہے آدمی

یہ... اور اس سے کہیں زیادہ ہیں یسوع ناصری — میرے ذہن میں تو یہی دو ہزار سال کی تصویر ہے۔ دیکھیے نا کتنے... کتنے بڑے آدمیوں کو کس برے سلوک میں رکھا ہے آدمی نے، کبھی اکیلے میں لگتا ہے کہ رو پڑوں گا، یسوع اور حسین اور زرّیں تاج اور میسٹر تاراج کی میرا اور ہزاروں اچھوں کے لیے۔

اور مکّے کے تاریک دنوں میں یا تیرہ بخت دانتے کے انفرنو حلقۂ نہم میں محمدؐ کے لیے جو برا سوچا گیا، اس پر حد درجہ برہم ہوسکتا ہوں یا چیخ چیخ کے رو سکتا ہوں میں۔ مجھے کوئی شرم نہیں۔

9 ستمبر 2001ء

باسمہٖ تعالیٰ

برادرم!

مجھے مصائب کے بیان میں تسکین نہیں ملتی۔

حاشا! یہ میں کسی کے معتقدات پر حرف زنی نہیں کر رہا، توبہ توبہ۔ میں تو خود کو ہمہ وقت کسی بھی نشانے کی زد پر سمجھتا ہوں اور آئینے کے سوا کسی کو بتاتا نہیں کہ میرا کیش اور میرا مسلک کیا ہے۔ تو بھائی! میں کسی سے اس کے عقیدے پر کیا سوال کروں گا اور کیوں کروں گا؟ کس لیے کہ میں آدمی کو ایک بے پناہ عظیم المرتبت scheme of things کا حصہ جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ یہ جس رنگ روپ میں بھی ہے، من موہنا ہے۔ مجھے اس کا تیج اور تجمل اور اس کا آنند بھلا لگتا ہے۔ تو جو جہاں بھی ہے، خوش رہے... بس۔ اور اگلی بات وہی کہ مجھے مصائب کے بیان میں تسکین نہیں ملتی۔

وہ اس لیے بھی کہ میرے باپ کا دین شوکت و دبدبے کا دین تھا۔ حج سے لوٹے تو میرے والد بتانے لگے کہ کعبے کے طواف میں سینہ تان کے اور اکڑ اکڑ کے، گویا (اپنے اور) اپنے خدا کے شوکت و جلال کا اظہار کرتے ہوئے چلنا ہوتا ہے۔ تاکہ غیر دیکھیں اور مرعوب ہوں۔ correct!

اور وہ کہتے تھے کہ یہ واحد موقع ہے جو زمین پر اکڑتے، اینڈتے ہوئے چلنے کو کہا گیا ہے۔ correct!

اور ابا کے خیال میں مصائب کا اور مظلومیت کا اظہار جس کا جی چاہے کرے، پر اور کے زئی لوگ ناں ہی کریں تو اچھا ہے۔ کیونکہ اس سے نقصان یہ ہوگا کہ دشمن (؟) ہمیں کمزور سمجھیں گے اور ہمارے مقابلے میں اپنی زور آوری کا بکھان کریں گے۔ اور یہ خفت کی بات ہوگی۔ correct!

اس لیے میں بھی کہتا ہوں کہ (وقت آئے تو) کھڑے قد سے زمین پر آ رہنا زیادہ glamorous ہے: بہ نسبت اس کے کہ پہلے زمین پر گھٹنے آئیں، پھر کہنیاں پھر جبین بر سر خاک ہو۔

ابا جس طرح چاہتے تھے، اسی طرح گئے اور سید سلیم احمد بھی۔

گھر والے بتاتے ہیں کہ ابا کچھ وقت coma میں رہے، پھر ایک بار آنکھیں کھول کر انھوں نے گرد و پیش کو دیکھا۔ اشارے سے پوچھا کہ کیا پاکستان خبر کر دی گئی ہے؟ پھر کچھ پڑھتے رہے اور چلے گئے۔

کھڑے قد سے آ رہے زمین پر۔

اور اپنے سیّد صاحب نے بھی رات سونے کے تکیے پہ سر رکھا۔ سویرے معلوم ہوا کہ وہ جو صاحب تھے وہ گمان کا دریا پار کر گئے۔

تو اب کہنا یہ ہے کہ نام کا آوازہ پڑنے سے پہلے میں نے ایک نوع کی شوکت وصلابت اپنے باپ سے اور اپنے اس دوست سے سیکھنے کا جتن کیا ہے (اگر یہ اکتسابی ہے تو)۔
ورنہ دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔

پہلے کہیں میں نے اسپین کے ساحلی شہر مالگا کے Plaza de Sol کا نام لیا تھا۔ Sol یعنی سورج۔ جسے میرا دوست زلفی کتابچے سے اٹھائی ہوئی اپنی عبرانی میں ''شم مش'' کہے گا۔ تو اس کے لیے یہ پلازا ہوا ''چوک شم مش۔''

اسپینی ٹورزم والے مالگا (یا مالقہ) کے ساحل (لوکیشن بحیرۂ روم) کو 'ساحلِ آفتاب' کہتے ہیں۔ Costa de Sol۔ پھر ان کے وہاں کئی جگہ Puerta del Sol یعنی گیٹ وے اوف دی سن ہیں، یعنی باب الشمس یا درِ مہر۔ سورج پر گویا بڑا کام ہوا ہے۔ یہ ٹورزم انڈسٹری کی برکتیں ہیں۔
سارے یورپ ہی میں — خاص کر اوپر اسکینڈے نیویا کے ملکوں میں پیسا بہت ہے، دھوپ نہیں ہے یا سمجھو کم ہے تو وہاں کے بندے دسمبر تک میں ڈھکے کھلے، کچھ پہنے کچھ نا پہنے چلے آتے ہیں اسپین کے ساحلِ آفتاب پر۔ سردی ہوتی ہے تو مقامی باشندے سردی کا ٹھیک ٹھاک لطف لیتے ہیں، مگر ان کے یوروپین، بالخصوص اسکینڈے نیوین دوست آسٹریلیا نہ جا کر یہیں یورپ میں اپنے حسابوں Sunny Christmas منا لیتے ہیں — جیسی جس کے گمان میں آئی۔ بھائی! لاکھ بحیرۂ روم کا معتدل ساحلی موسم ہو، ہمارے حساب سے تو اسپین میں سردیوں میں گگر بجتی ہوگی۔ تس پہ بھی سیاحوں کے لیے تیار کیے گئے کتابچے ''ساحلِ آفتاب'' اور ''چوک شم مش'' اور ''دروازۂ خاور کھلا'' کا جاپ کرتے رہتے ہیں۔
سارے سال جہاز اور ریلیں بھر بھر کے ٹورسٹ چلا آتا ہے۔ خیر جی، ہمیں کیا۔ ان کا سورج ہے جیسے چاہیں استعمال کریں یا نا کریں۔ آخر ہم بھی تو ہیں کہ اُپلے سکھانے کے سوا سورج سے کوئی کام ہی نہیں لیتے۔

دارالخلافے مادرِد میں بھی سب شہروں کی طرح ایک چوک شم مش ہے۔ مادرِد کی بندر روڈ ''ویا گران'' (ترجمہ شاہراہِ عظیم الشان) کی ایک گلی کے جس ہوٹل میں ہم ٹھیرے تھے، اس سے ملحق صاف ستھرے کھلے کھلے 'بوہری بازار' میں آپ سلیقے سے بھٹک جائیے تو کسی نہ کسی طرح اس چوک شم مش میں پہنچ جائیں گے۔

ہم دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ مادرِد شہر کے بابوں (بابے کی جمع) نے اس چوک کا نام بہت صحیح رکھا ہے۔

مادرِد میں قیام کے اس پہلے دن اگر بادل گھرے ہوئے نہ ہوتے تو سرتاسر خوشگوار دھوپ سے بھرا ہوتا یہ پلازا دی سول۔

ہم اور ہدایتکار دوست اس چوک تک خالص دنیاوی غرض سے گئے تھے، یعنی چھوٹا سا ایک آدھا سفری چیک بھنانا تھا تاکہ شہر میں set ہونے کے لیے ابتدائی funds مہیا ہو جائیں۔ مگر گئے اور پھنس گئے، وہاں پہنچ کر یوں لگا کہ جیسے ہم مادے سے بلند ہو گئے ہیں اور خود ایک لطیف (بلکہ ماورائی) گردوپیش میں ہیں اور لوگوں کو — مادرِد والوں کو، دیواروں، دروازوں، ستونوں سے ٹیک لگائے، ان کے مصروف اوقات میں بھی، جاگتے میں خواب دیکھتے محسوس کر سکتے ہیں۔ ہمیں لگا کہ ہر کوئی دوسرے کے لیے مہر و مروّت سے سوچ رہا ہے۔ وہ چہرے پر آدھی مسکراہٹ لیے سامنے دیکھتا ہے اور جو آپ سے نظر مل جائے تو ہلکی... بہت ہلکی nod سے آپ کو گویا approve کرتا ہے، لفظوں کا استعمال کیے بنا کہتا ہے کہ ''you're okay۔ آپ جیسے بھی ہو ٹھیک ہو اور میں بھی صحیح ہوں۔''

اکیلے دو کیلے جوڑے (زیادہ تر pattern یہ بن رہا تھا کہ مقامی لڑکی اور افریکن لڑکا) جہاں تہاں سڑک پر چلتے یا دیوار سے ٹیک لگائے یا کونے میں کھڑے، ایک دوسرے میں مگن، انہماک کے ساتھ ماؤتھ ٹو ماؤتھ (شاید ڈوبے ہوؤں کے rescue operation) میں مصروف تھے۔ ان کی مستعدی دیکھنے لائق تھی، جیسے کسی برکت والی ساعت میں کارِ ثواب میں لگے ہوں۔

''سبحان اللہ!'' ہدایتکار بولے، ''کیا استغراق ہے!'' پھر پوچھنے لگے، ''ہاں برادر!؟... استغراق ہی کہا جائے گا نا؟''

میں نے کہا، بیشک۔

دوسری تیسری بار اس طلسمی چوک پر جانا ہوا تو میں نے لوگوں کے علاوہ بھی بہت کچھ دیکھا۔
چوک کے وسط میں ایک یادگاری بن رہی تھی ـــ کوئی abstract مجسمہ جسے ریگزین یا پلاسٹک کے برقعے میں چھپا دیا گیا تھا۔ مجھے جست کے shafts اس برقعے سے جھانکتے ہوئے دکھائی دیے۔
ہوسکتا ہے sun god یا دیوی ارونا یا بھاسکر دیوا جیسا کچھ بنایا جا رہا ہو اور یہ جستی shafts جنھیں ہم نے جھانکتے دیکھ لیا تھا، اس کے انوار کی تجلیاں ہوں۔ اللہ ہی جانے۔

ایک برس سے زیادہ ہو گیا، اب تک تو مجسمہ بن چکا اور unveil کیا جا چکا ہوگا۔

مادرِد کا یہ چوک شم مش، شہر میں قدم جماتے ہوئے اور قدم جما چکے افریقی الاصل نوجوانوں اور پاکستانی، ہندوستانی، جاپانی اِمی گرنٹس کا رمنہ ہے اور یہ کم دلآویز جپسی لڑکیوں کے غیر جپسی عاشقوں کی پسندیدہ haunt ہے۔ میں نے ''کم دلآویز'' جو کہا تو اس لیے کہ وہاں ایک وقت میں چار جپسیاں دیکھنے کو ملیں۔ ایک (عمداً یا مجبوراً) خود کو ریٹارڈ ڈ بنا کے پیش کر رہی تھی۔ دوسری تھوڑی سی بھینگی تھی ـــ یا بنی ہوئی تھی ـــ اور باقی دو جو تھیں وہ از کارِ رفتہ تھیں۔ یہاں کے برخلاف ہم نے الحمرا (غرناطہ) کے مضاف میں بعض ''قیامت خیز/توبہ شکن'' (دونوں اسمائے صفات میرے ڈالے ہوئے نہیں، بھائی پروڈیوسر کا عطیہ ہیں) خانہ بدوشنیں دیکھی تھیں۔ ان کے بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔

مختصراً یہ کہ خدا ان کی عمریں دراز کرے۔

چوک شم مش کی وہ تھوڑی بھینگی جپسن (اور اس کا عاشق، دونوں ہی) حد درجہ استاد نکلے۔
تفصیل عرض کرتا ہوں۔

میں اور ہدایتکار دوست آدھے گھنٹے سے زیادہ اس جپسن کو observe کرتے رہے تھے۔ وہ اپنے جپسی get up، مطلب گھاگھرا، منکوں کے زیورات، سر سے بندھے رومال اور قسمت کا حال بتانے والے ہارڈ ویئر کے ساتھ ضرور تھی، تاہم پتھر کی منقش دیوار سے ٹیک لگائے وہ اپنی زبان میں Harold Robbins کی *The Carpet Baggers* پڑھ رہی تھی اور قسمتوں کا حال بتاتی ہوئی اپنا کھا، مانگ رہی تھی۔ پاس ہی اس کا (دراصل اس کے عاشق کا) میلا، لانڈری کو بھیجے جانے لائق جھبرا

سفید کتا بڑا سو رہا تھا۔

دنیا بھر کے قدیم Juveniles کے لیے روبنز کی کتابوں کا درجہ وہی ہے جو سخت اسلامی قارئین کے دلوں میں صادق حسین صدیقی سردھنوی یا نسیم حجازی ٹائپ کی "فتح یرموک" یا "اور تلوار ٹوٹ گئی" کا مرتبہ ہوگا۔

میں نے اپنے juvenile years میں روبنز کو اور اس سے پہلے کے زمانے میں سردھنوی کو پڑھا تھا، اس لیے دونوں مظاہر کو سمجھ اور انالائز کر سکتا ہوں۔

اس پاسٹ جووی نائل عمر کی بی بی کو اتنے انہماک سے روبنز پڑھتے دیکھ کر کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔ حیرت اس وقت ہوئی جب اس کا (بظاہر غیر جپسی اور بظاہر نابینا) عاشق سیاہ چشمہ پہنے سفید چھڑی لہراتا آیا۔ آتے ہی اس نے چشمہ اتارا، بی بی کی کتاب ایک طرف سرکائی، اُس کے شلوکے میں ہاتھ ڈال، اب تک کے کمائے سب پیسے قابو کیے، انھیں احتیاط سے گن کر چھوٹے بڑے denominations کی ترتیب سے جمایا۔ جمانے کے بعد اپنی ہپ پاکٹ میں پہنچایا۔ ہمیں آنکھ ماری پھر کتے کا سر سہلایا، پانچ سات منٹ اس کے ساتھ کھیلا، ازاں بعد جپسی بی بی کو پہلو میں لے، اس پہ ہر طرف سے توجہ کی اور پھر وہی ڈوبتے ہوؤں کو rescue والی ماؤتھ ٹو ماؤتھ کی ایمرجنسی خدمات انجام دیں، شلوکے میں ہاتھ پہنچا کے اسے تھپکتا، تسلی دیتا رہا پھر جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے کالا چشمہ پہنتے ہوئے چلا گیا۔

بی بی نے دوبارہ ہیرلڈ روبنز کھول لیا اور وقفے وقفے سے گاہکوں اور مخیّر لوگوں کے نصیبوں کا حال بتانے لگی۔

ہدایتکار دوست، اُدھر، جس گلی میں جپسن کا عاشق گیا تھا، دیکھتے ہوئے خاصے جھنجھلا کے بولے: "وہ حرام الدہر، نابینا، سب پیسے کھینچ لے گا اس کے... دیکھ لینا، قلاش کر دے گا۔"

میں نے کہا: "یہ بھی حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔ اُس سالے سے، اُس کے جھبرے کتے تک سے بھیک نہ منگوا دے تو کہنا۔"

19 ستمبر 2001ء

بارے کوٹھوں کا کچھ بیاں ہو جائے

بھائی!

شہروں کا ایک بگاڑ یا شامت کہہ لیجیے، یہ ہے کہ وہ پھیلتے ہیں تو ایک یا ایک سے زیادہ ریڈلائٹ ڈسٹرکٹ وجود میں آتے ہیں جہاں (انگریزی محاورے میں) قدیم ترین پیشہ کرنے والیاں اور کرانے والے آبیٹھتے ہیں۔ کبھی اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے کہ پہلے ایک کوٹھا قائم ہوتا ہے، بعد کو عامتہ الناس پہنچنا شروع ہوتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے شہر بس جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے غلام عباس صاحب کی کہانی ''آنندی''۔

میں نے ''کرانے والے آبیٹھتے ہیں'' لکھ کر اُن قرمساق دلالوں کو گفتگو میں شامل رکھا ہے جن کے بغیر یہ بازار مناسب رفتار سے چل نہیں سکتا۔ بیسواؤں، نکیائیوں پر بات کرتے ہوئے ان صاحبان کے ذکر اذکار ضرور ہونے چاہئیں۔ ورنہ ہوتا یہ ہے کہ اپنا ''اچھا'' وقت گزار کر نکیائیاں غریب تو بڑھاپے سمیت بہت سے عوارض میں مبتلا ہوتی اور اپنی ذلت و خواری میں مٹ جاتی ہیں مگر یہ صاحبان موقع پاتے ہی لوکیشن بدل لیتے ہیں اور کلف لگے کپڑے پہن کر گھی چپڑی روٹی کھانے اور نیک باتیں کرنے لگتے ہیں۔ جی کرتا ہے تو تیرتھوں زیارتوں پر نکل جاتے ہیں۔ اس لیے منٹو صاحب نے ریڈلائٹ ڈسٹرکٹ سے اٹھائی ہوئی اپنی (تقریباً) ہر کہانی میں انھیں، دلالوں کو، شامل رکھا ہے

— نکلنے نہیں دیا ہے سسروں کو۔

میں نے اردو فکشن پڑھنا شروع کیا تھا تو وہ دور چل رہا تھا کہ میاں ایم اسلم اور دوسرے معتبر لکھنے والے ''حسنِ سوگوار'' یا اسی قبیل کی ناولیں لکھتے تھے، برسوں پہلے ''امراؤ جان ادا'' چھپ کر مقبول ہو چکی تھی۔ ہمارے بیشتر لکھنے والے سخت رومانی ماحول میں اداس ہو ہو کر کوٹھوں پر جاتے اور اسٹیریو ٹائپ کہانیوں میں ''مطرباؤں'' کے شب و روز کی اداسی بیان کرتے ہوئے آجاتے تھے۔

خیر، ترقی پسند آئے، انھوں نے خاصی ڈانٹ ڈپٹ کی اور اردو کہانی کو کوٹھوں ووٹھوں سے اتار کر کھولیوں وغیرہ میں لائے۔

اور کچھ برس گزر گئے، ترقی پسند بھی قصۂ پارینہ ہوئے، علامتی دور اور پھر سن پچھتر، سن اسی آ گیا۔ تو یہ اُس زمانے کی بات ہے جو میں اس وقت سنانے جا رہا ہوں۔

ایک ہفتے وار اردو جریدے کے مدیر نے مالکِ جریدہ کی فرمائش پر — جو بہت سے مطرباؤں والے ناول پڑھ چکا تھا — مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے آمادہ کیا کہ میں کوٹھے پر کوئی قسط وار کہانی لکھوں۔ میں نے کہا برادرم! اپنے اس جہل پر شرمندہ ہوں کہ میں نے کوٹھے نہیں دیکھے، کس لیے کہ پشتینی زمیں داری ختم ہو چکی تھی، والد اسکول پڑھانے لگے تھے اور ہم بچوں کی مصروفیات کو ٹھیک ٹھاک مونیٹر کرتے تھے پھر ہماری بلوغت کا زمانہ سینتالیس اور ہجرت کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ گویا ہم وہ تھے جن کو عہدِ جوانی نہیں ملا۔

تاہم، میں نے بتایا کہ جب میں علامہ میکش اکبرآبادی کے ایک داماد کی وجہ سے دو روز کے لیے آگرے میں ان کا مہمان ہوا تھا اور ہوا کی تلاش میں چھت پر جا سویا تھا تو دوست سے معلوم ہوا تھا کہ یہ سامنے فلم ''برسات'' کی ممتاز کا کسی زمانے کا کوٹھا ہے اور وہ دور تاج محل نظر آ رہا ہے۔ ممتاز کے برابر کا بالا خانہ عین میرے پلنگ کے سامنے واقع تھا تو میں نے اس کی ایک منزل پر مجرے ہوتے سنے اور دوسری منزل پر جھک مارنے کی غرض سے آنے والے گاہکوں کو آتے جاتے دیکھا۔

میری سماعت کی زد اور فیلڈ اوف وژن سے ذرا بلندی پر اُس کوٹھے کی چھت تھی جہاں in-mates کی چارپائیاں بچھی تھیں اور کھلا آسمان تھا۔ ڈیڑھ دو بجے کے بعد مطربہ اور اس کی بوڑھی

نائکہ آئیں۔ جھلنگا چارپائیوں پر بیٹھ کے انھوں نے آٹے دال چاول کی mundane باتیں کیں، کھانا کھایا، جس کے دوران وہ ایک دوسرے کو اصرار کر کے اچار اور گھی ملا گڑ دیتی رہیں۔ پھر مطربہ نے اپنے بہت چھوٹے بھائی (یا بیٹے) کو جگایا، منایا اور خوشامد کر کر کے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔ بعد کو لڑکے نے اپنی اس ''آپا'' سے (وہ یقیناً اس کی ماں ہوگی) کہانی سننے کی ضد کی تو اس نے بہت لاڈ سے کہانی سنائی جو ''گلِ صنب براور باشا جادے'' کی کہانی تھی۔

میں نے اپنے شہر کے مقبول جریدے کے مدیر کو یہ بھی بتایا کہ جب میں پندرہ سولہ برس کا تھا تو اپنے ایک کزن اور اس کے زیرِ تربیت پولیس مین دوست کے اصرار پر سردیوں میں اوورکوٹ میں چھپ کر اپنے پرانے شہر کے مضاف میں رنڈی بازار دیکھنے بھی گیا تھا۔

میں نے بتایا کہ یہ ایک نہایت غیر دلچسپ تجربہ تھا جس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔

شہر کے پاور ہاؤس نظام کو ٹھنڈا رکھنے والے حوضوں کے ساتھ ہی جھونپڑیاں اور کچی باڑیاں سی بنی تھیں (اُن حوضوں کو مقامی بولی میں گرم گڈھے کہا جاتا تھا)۔ باڑیوں میں نیچے گودام جیسے تھے اور بہت سی سیڑھیوں کے اختتام پر بڑے دریچے یا چھوٹے دروازے تھے جن کے بیچوں بیچ ننگے بلب جل رہے تھے۔ بلبوں کی خیرہ کن موجودگی میں (شاید آٹے کی مدد سے) اپنے چہرے سفید کیے دو تین miserable دیہاتنیں بیٹھی تھیں۔ ایک نے ہمیں گزرتے دیکھ کر آواز دے کے کہا تھا کہ آجا رے راجا! اوپر آجا، گرمی آجائے گی۔

تجسس ختم ہو چکا تھا اور ہم دونوں کزن اور وہ زیرِ تربیت پولیس والا خفت میں کھلکھلاتے اور سردی سے کانپتے بھاگ آئے تھے۔

میں نے مدیر سے کہا کہ بھائی! آپ ہی بتایے اتنے puny تجربوں سے میں کہاں کا اور کتنا کوٹھاری کری ایٹ کر پاؤں گا؟

وہ بولے مشاہدہ بھی تو کوئی چیز ہے۔ صاحب! یہ پرانے قصے چھوڑیے آپ اب جائیے کوٹھوں پہ۔ مشاہدہ کیجیے، کچھ مطالعے سے بھی کام لیجیے۔ شورش صاحب کی کتاب ''اس بازار میں'' بار بار پڑھیے۔ اور بھی کتابیں ہیں۔ ہو سکے تو imagination سے کام لیجیے۔ لکھنے والا تو وہ جن ہوتا ہے کہ

جب چاہے اپنے دماغ میں اچھی خاصی ہیرامنڈی آباد کر سکتا ہے۔

پھر یہ بھی تو ہے کہ ہم سب کو ہزار دیتے ہیں۔ آپ کو ایک قسط کے پندرہ سو روپے دیں گے۔

یہ آخری بات مناسب طور سے میری سمجھ میں آ گئی۔

میں نے پرچے کے لیے سیریل لکھنا شروع کر دیا۔ دس بیس قسطوں کے بعد جریدے کے مالک نے چائے پر بلایا۔ کہنے لگا کہ محترم! کہانی میں کچھ مزہ نہیں آ رہا، نہ قتل ہوئے ہیں، نہ کوئی سنسنی خیز ٹرن (گویا turn) آیا ہے۔ آپ تو اپنے زنانہ کرداروں کے بیڈروم تک میں نہیں جاتے۔ میں نے کہا، ''برادرم! میرا وہاں کیا کام؟'' وہ ہنسے، پھر اداس ہو گئے، بولے کہ آپ نے اس طبقۂ اناث کو exploited اور مظلوم بنا کے پیش کیا ہے۔ ''سر! معافی چاہتا ہوں یہ تو بڑی چھنالیں ہوتی ہیں اور حضرت! یہ کیا کر رہے ہیں آپ کہ دلالوں کو اتنا منافق اور بھیانک دکھا رہے ہیں۔ دیکھیے نا، برائی کی اصل جڑ تو یہی فاحشائیں ہیں۔''

میں نے کہا، ''فاحشاؤں کو چھوڑیے ...اب چلتا ہوں، کل فون کروں گا۔'' اور میں چلا آیا۔ میرے رخصت ہونے کے بعد مدیر سے کہنے لگے کہ اگر خاں صاحب کو نہیں روکا گیا تو سیریل کے آخر ہوتے ہوتے وہ اس کوٹھے کی سیڑھیوں سے دو چار کرداروں کو سفلِس یا گنوریا میں مبتلا کر کے اتاریں گے (اس وقت تک AIDS کا ذکر اتنا عام نہیں ہوا تھا) ان سے کہو سر! ویسے ہی کافی دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ اپنے قاری کو اور ہلکان اور اداس نہ کریں۔ خیر، میں نے فوری طور پر یہ سیریل بند کر دیا اور کہیں اور، کچھ اور کرنے لگا۔

⁂

میں نے ''کہیں اور، کچھ اور'' کرتے ہوئے عمرِ عزیز کا بڑا حصہ گزارا ہے۔ لکھنے والا بھی عام لوگوں کی طرح اپنا اصل دھندا — یعنی لکھائی — نمٹانے کے لیے روزی کمانے کے بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔ وہ بندرگاہ پر کام کرتا ہے، ٹریول ایجنسی میں یا ریلوے میں نوکری کرتا ہے۔ کچھ دنوں کے لیے کلرک، پبلشر، کمرشیل آرٹسٹ، انگریزی کا استاد یا ریڈیو نیوز ریڈر ہو جاتا ہے ...ایسی کتنی ہی مصروفیات ہیں۔ اور لکھنے والا کیونکہ لکھنے پڑھنے کے سوا کم ہی کوئی اور کام اتنی لیاقت اور مہارت سے کر سکتا ہوگا،

اس لیے وہ جھٹ کمرشیل رائٹر بن جاتا ہے۔ ریڈیو ٹیلی وژن کے لیے گیت اور ڈرامے یا فلموں کے لیے مکالمے لکھتا ہے اور نظیرا کبرآبادی کی طرح ٹیوشن پڑھاتا ہے۔

میں خوش ہوں کہ میں نے اوپر بیان کیے گئے سب کام کیے ہیں اور اس دوران جنت مکانی ابا کی دو بنیادی ہدایتیں یاد رکھی ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ میاں! کبھی اپنے لیے، یا اپنوں کے لیے گری ہوئی روئی مت اٹھانا اور خود کبھی گری ہوئی مجلس میں نہ بیٹھنا (یہ واضح طور پر رنڈی بازوں کی صحبت سے بچتے رہنے کو کہا گیا تھا)۔ وہ کہتے تھے کہ یہ دونوں کام self respecting بھلے لوگوں کے کرنے کے نہیں ہیں۔ تو میں نے اٹھاون برس کی عمر تک اپنی مجلس کے سلسلے سے احتیاط برتی مگر پھر کچھ نہ کچھ wayward لکھنے کے لیے (یا کسی طرح کا تجسس کہہ لیجیے) مجھے بیسواؤں کے علاقوں/کوٹھوں میں بے ثواب (اور مختصر) تاک جھانک بھی کرنی پڑی، سو میں لندن کے علاقے سوہو میں گھوما، پیرس کے محلے پگال میں منڈگشت کی، بنکاک شہر کی میونسپل حدود میں موجود رہا (وہاں وہ لائیو شو دیکھا جو کاما سوترا کے مصنف نے دیکھا، سنا، سوچا تک نہ ہوگا)۔ اور میں شہر غرناطہ کے ایک مشہور اڈے "سان خورخے کلب" یعنی ولی جورج (نوراللہ مرقدہٗ) کے نام سے منسوب کوٹھے پر بھی گیا۔

اب جبکہ سانجھ کی بیلا ہے، پرندوں کے گھر لوٹنے کا وقت ہے تو میں بڑی ہیکڑی کے ساتھ یہ سب لکھ رہا ہوں۔ میرے بچوں کے بچے تک میری timing کی اس چالاکی پر ہاتھ کی اوٹ کیے مسکرا رہے ہوں گے۔

مگر ذرا رکیے! پہلے میں آپ کو مادرِد (Madrid۔ اسپین) کے Bash Bojari سے ملاتا ہوں۔ انھوں نے پہلی ملاقات میں ہم سے یہی کہا تھا کہ دوستو! یہاں مادرِد میں کوئی اطالوی آپ سے بات کرنا چاہے تو ٹال جانا، اشارے سے کہنا کہ ہم انگریزی تک نہیں جانتے، sorry۔ ہم نے پوچھا کس لیے؟ کہنے لگے، اطالیہ کے بھلے لوگ ادھر کم ہی آتے ہیں۔ بیش تر وہی سفلے، جو روم میں بھی دلالی پیشہ تھے، ادھر آن مرے ہیں اور ماحول خراب کر رہے ہیں۔ اس لیے برادرم! سوری کہہ کے جان بچانا۔ اللہ بہتر کرے گا۔

بیش بوجاری اپنی طرف کے ہیں— پوٹھوہار کے یا لائلپور کے میدانی علاقے کے پیدائشی—

نام ان کا بشارت بخاری ہے۔ لفظ بشارت کو انھوں نے عام اسپینیوں کے لیے Bash کر کے آسان کر دیا ہے اور کیونکہ Spanish میں جیم کی آواز کو خ (اور کبھی 'ح') سے اور حرف خ کو جیم سے بدلنے کا دستور ہے، سو یہ بخاری سے بجاری بلکہ بو جاری ہو گئے۔

سنا ہے کہ کبھی یہ اپنی ایئر فورس میں جنرل ڈیوٹی پائلٹ تھے، بعد کو فلائنگ افیسر یا فلائٹ لیفٹیننٹ کے عہدے سے ریٹائر ہو کر ماد رد کے ہوائی اڈے پر جہازوں کو اڑانے اتارنے کی اجازت دینے والوں میں ملازم ہو گئے۔ ان کے کہے بنا پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ اوپر سے دوسرے (یا تیسرے) نمبر کے منصب پر فائز ہیں۔

میں نے یہ تفصیل جان کر کہا کہ بیش صاحب! پھر تو آپ کوٹ ماد رد کے نائب قلعہ دار ہوے؟ تو عزیزم افتخار عارف کی طرح ہنسے اور اپنی ناک کے بانسے پر ایک انگلی سے چشمہ ٹھیک کر کے بولے، ''جی سرکار! نیاز مند ہوں ہہہ ہا... جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔''

یہ پہلی ہی ملاقات میں اتنے مزے کے آدمی لگے کہ میں نے دل ہی دل میں انھیں ان لوگوں میں شامل کر لیا جنھیں کم سے کم سات خون معاف کیے جا سکتے ہیں۔

بعد کو احساس ہوا کہ شامل کرنے کا یہ عمل بہت ضروری تھا، اچھا ہوا جو بر وقت شامل کر لیا۔

اپنے بیش صاحب پوٹھوہاری (لائلپوری؟) ہوائی جہازوں کے علاوہ بھی اڑاتے بہت ہیں۔ تفصیل عرض کرتا ہوں۔

ماد رد میں ہم سے ملاقات کے دوسرے ہی دن انھوں نے ویا گران (ماد رد کی دو عظیم الشان شاہراہوں میں سے ایک) کے ایک پاکستانی ہوٹل میں ہمیں رات کے کھانے پر بلا لیا۔ اپنی روایتی پوٹھوہاری (یا لائلپوری؟ — اب یاد نہیں) مہمان نوازی سے کام لیتے ہوے بیش صاحب، ہماری ضیافت کے لیے ہوٹل والے کو فون پر کوئی درجن بھر dishes لکھوا چکے تھے۔ خیر، ہم قریب ہی ٹھہرے ہوے تھے، قبل از وقت جگہ دیکھنے کی نیت سے (ویسے بھی بیکار بیٹھے تھے) ہم ٹہلتے ہوے ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں جب یہ معلوم ہوا کہ بیش صاحب نے ہمارے لیے اتنا وسیع دستر خوان سوچا ہے تو ادھر اُدھر فون کھڑکھڑا کے ہم نے انھیں تلاش کیا اور گزارش کی کہ ہم اتنا بہت سا اور اس قدر متنوع

نہیں کھا پائیں گے، تھکے ہوئے ہیں، ویسے بھی کراچی سے آئے ہیں۔ اس لیے ازراہِ کرم کچھ ڈشیں معزول کرا دیجیے۔ اس کی پر بیش بہت مشکل سے راضی ہوئے۔ (بھائی! آپ نے یہ کمی اور بیشی کا حسن تضاد ملاحظہ کیا؟)

خیر، وقت مقررہ پر یہ بھی اور ہم بھی ہوٹل پہنچے۔ کھانا شروع ہوا۔ حسبِ معمول پہلے مشروب منگائے گئے۔ ہدایتکار دوست نے معذرت کر لی۔ اگرچہ جانتے تھے کہ دل آزاری گناہ ہے۔ تاہم میں نے تالیف قلب کے لیے کچھ پیشرفت کی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ خیر، بیش نے اپنے ظروف سے کھیلتے ہوئے جیسے شہرِ خوش کلامی کا دروازہ کھول دیا۔ کیا مزے مزے کی باتیں کیں اس شیرِ بیشۂ گفتار نے کہ جی خوش کر دیا۔

بتانے لگے کہ ایئر فورس میں خدمات کے دوران انھوں نے طیاروں کو جس بے جگری سے سطح زمین (یا درختوں کی پھننگوں) سے آدمی کے قد اتنی جگہ چھوڑ کے اڑایا ہے تو وہ واقعات اپنی فضائیہ کے legend کا حصہ ہیں (بعض واقعات تو بیش صاحب کی سروس بک میں سرخ روشنائی سے درج کر دیے گئے ہیں) بیش کو پوری سروس کے دوران سات بار reprimand کیا گیا۔ دو مرتبہ CL (یعنی confinement to lines) ملا۔ ایک مرتبہ تو وردی اتر جاتی اگر بزرگوں کی دعائیں شاملِ حال نہ ہوتیں۔ آخر بے جگری سے طیارہ اڑانے کے سلسلے میں انھیں نہلتے، بڑھاوا دیتے ہوئے چار چھ میڈل عطا کیے گئے اور فضائیہ سے فارغ کر دیا گیا۔ اب یہ پچیس برس سے کوٹ مادرِ دکے نائب قلعہ دار ہیں (واضح رہے کہ پندرہ سولہ سال یہ اپنی فضائیہ میں طیارہ شکن تیز رفتاری بھی دکھا چکے ہیں، تو کل مدت پچیس جمع پندرہ مساوی چالیس ہوئی)۔ ہدایتکار دوست نے ڈرتے ڈرتے کہا، ''بیش! آپ مجھے بیالیس پینتالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ یہاں اور وہاں ملا کے کوئی...؟''

ہنسنے لگے، بولے، ''یہاں جو چھ برس میں نے بُل فائٹنگ کی ہے اس کا تو ابھی کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ بھائی جان! میں جتنا ینگ نظر آتا ہوں اصل میں اتنا ہوں نہیں، ہہ ہاہا... یہی حیرانی شاہِ اسپین ہز میجسٹی کنگ کارلوس دی سیکنڈ کو بھی ہوئی تھی۔''

کنگ کارلوس کے حوالے پر زیادہ سے زیادہ مسکرایا جا سکتا تھا— ہنسنا ممکن نہیں تھا— کتنی ہی

کہانیوں میں سنا تھا کہ بادشاہوں پر یا ان کا نام نامی سن کر ہنسنا، کھلکھلانا بربادی کو دعوت دینا ہوتا ہے۔

خیر، بیش بتانے لگے کہ جب پہلی بار یہاں مادرِد میں ایوی ایشن کلب کی ایک تقریب میں ماخس تاد (میجسٹی) تشریف لائے تھے تو انھوں نے اس خادم کی طرف نظر کی تھی اور Spanish میں فرمایا تھا... یہاں بیش نے شاہ کے فرمودے کا انگریزی ترجمہ سنایا جس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ خیر، وہ کچھ اس طرح کا تھا کہ ینگ مین! تمھارے بارے میں ہوائی رسل و رسائل کے وزیر نے کلماتِ خیر کہے ہیں، ہم خوش ہیں (بادشاہ لوگ ''میں'' نہیں کہہ سکتے، ہمیشہ ''ہم'' کہتے ہیں)...ہم خوش ہیں کہ تم اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں یہاں مادرِد میں موجود ہو۔ پھر شاہ کارلوس نے از راہِ شفقت فرمایا کہ میاں! ملتے رہا کرو۔

آگے بیش بتانے لگے کہ شاہ اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنی بار ملے ہیں کہ ایک نوع کی بے تکلفی ہوگئی ہے۔

میں نے پوچھا،'' وہ آپ کا نام لیتے ہوں گے؟''

بولے،'' اور کیا؟...بیش کہتے ہیں یا بہت لاڈ میں ہوئے تو 'ہائی ینگ مین' کہہ کے بلاتے ہیں۔''

میں نے کہا کہ آپ انھیں کیا کہتے ہیں؟ 'ہائی کارلوس!' یا 'ہیلو سیکنڈ!'؟ (ظاہر ہے، میں نے سوچا، فرسٹ کارلوس تو ہو گزرا) ہنسنے لگے، بولے،'' بھائی جان! بادشاہ آپ سے جتنا چاہے فری ہو جائیں آپ کو بہرحال پروٹوکول کی حدود میں رہنا ہوتا ہے۔ اس لیے میں بھی سب کی طرح انھیں 'ماخس تاد' یعنی Majesty کہتا ہوں۔''

ایسے ہی میں نے اپنی معلومات کے لیے دبے لفظوں میں پوچھ لیا کہ ان بادشاہوں وغیرہ کو خالی Sir یا Sire نہیں کہہ سکتے؟

ہدایتکار پریشان ہو کے بولے کہ واہ بھائی جان! سر، ور کہہ کے مرنا تھوڑا ہی ہے۔ شاید اپنے مغل لوگ تو اس طرح کی بے ادبی پر جن بچہ کولھو میں پلوا دیا کرتے تھے۔ پھر پوچھنے لگے،'' کیوں بیش بھائی! یہاں اسپین میں تو ایسا کوئی رواج نہیں ہوگا؟''

بیش مسکرائے۔ بولے،'' آپ دونوں بہت خوش مزاج ہو۔ خدا عمریں دراز کرے!''

میں نے کہا، "دوست! میرے سلسلے سے یہ درازیٔ عمر کا ریکٹ مت چلاؤ۔ میں ویسے ہی خاصا سینئر ہوں۔ پھر جو اپنی پیدائش کا سال بتایا تو مربیانہ تبسم کے ساتھ کہنے لگے، "میاں صاحب! آپ بڑے بیشک ہو لیکن اتنے بڑے بھی نہیں ہو، ہاہاہا! میرے آپ کے بیچ چند ہی برسوں کا فصل ہے۔"

اللہ جانتا ہے، ایسا متواضع جوان میں نے زندگی میں دوسرا نہیں دیکھا۔ خدا بیش بو جاری کے مراتب فزوں کرے۔

اب کچھ سان خورخے کلب کے بارے میں:

سنت جورج یا ولی خورخے کے روحانی منصب سے میں یا میرا ابداپیکار دوست اور میرا پروڈیوسر دوست تا حال ناواقف ہیں۔ غرناطہ کے یہ بزرگ، صلیبی مجاہد (دہشت گرد؟) کروسیڈر تھے یا کوئی شب زندہ دار عابد؟ ولایت ان کی مادرزاد تھی کہ پاپائے روم کی صوابدید پر ولی بنائے گئے؟ ہمیں نہیں معلوم۔ ہمیں کیونکہ دن کے اوقات میں الحمرا کے محلات (کمپلیکس) دیکھنے میں کامیابی نہ ہو سکی تھی اور کیونکہ سہ پہر کا وقت پہاڑ سا ہمارے شانوں پر دھرا تھا اور کیونکہ غرناطہ شہر سے جو ٹیکسی ہمیں ڈھو کر قصورِ الحمرا تک لائی وہ ابھی وہیں ڈولتی پھر رہی تھی، اس لیے بھائی پروڈیوسر نے اسے پھر engage کرلیا۔

انگیج کرتے ہوئے انھوں نے (اپنی دانست میں) ایک بے ساختہ خیر سگالی کے تحت اور ٹیکسی والے کے حسابوں کسی معنی خیز بے تکلفی سے کہا کہ دوست! ہمارے پاس تھوڑا وقت ہے، تو ہمیں کسی دلچسپ جگہ لے چل۔ ٹیکسی والا، اس خدائی خوار لفظ "دلچسپ" پر کھیل گیا اور خوشی خوشی ہمیں گاڑی میں بٹھا ولی خورخے کے آستانے پر لے آیا۔ ہم سمجھے یہ ملامتیہ فرقے کے کسی صاحب رمز بزرگ کا آستانہ ہے جو ممنوعات و مکروہات و نواہی کے روبرو لا کر وابستگانِ بارگاہ کی اصلاح فرماتے ہوں گے ورنہ یہ چھ آٹھ رنڈیاں یہاں بار سے ٹیک لگائے کھڑی کیا کر رہی ہیں؟

خیر، اب عرض یہ ہے کہ اور کچھ ملا ہو، نہ ملا ہو— (میں یہ کیا کہہ گیا؟) سچ تو یہ ہے کہ کبھی کچھ دیا ہے پالنہار نے، اور ایک عطیۂ خداوندی سے تو اس طرح نوازا گیا ہوں کہ کبھی تو بظاہر بے وجہ، بے اختیار زبان سے کلماتِ شکر ادا ہوتے ہیں (جنھیں لوگ ڈراما سمجھتے اور گھور کے دیکھنے لگتے ہیں)۔

وہ خداوندی عطیہ ہے Great Expectations کا کہ جب بھی کوئی بھلی بات ہونے والی ہوتی

ہے یا میں کسی بیان کردہ پُرفضا مقام کی سیر کو نکلنے کو ہوتا ہوں یا کسی پسندیدہ آدمی سے ملاقات کے لیے چلتا ہوں؛ تو میری خوش فہمی اس بھلی بات، اس پُرفضا مقام، اس پسندیدہ آدمی کا خوب بڑھا چڑھا کر ایک پیکر تیار کر لیتی ہے۔ پھر حقیقی دنیا میں جب وہ بھلی بات، وہ پُرفضا مقام، وہ پسندیدہ آدمی میرے سامنے آتا ہے تو اسے میں اپنی قائم کی ہوئی توقعات کے مطابق دیکھتا، برتتا اور خوش ہوتا رہتا ہوں۔

بے تکلف دوست اور گھر والے اسے میرا کوئیکزاٹک (Quixotic) رویہ کہتے ہیں۔ میں برا نہیں مانتا: تاہم ذرا سی تصحیح کے ساتھ ان سے اتفاق کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اسے ''معکوس کوئیکزائٹ'' کہہ لو، کیونکہ ڈون کیہوتے صاحب کی متخیلہ مشتعل ہوتی تو ہوا چکی کو راکھشس سمجھ لیتی اور انھیں بھڑ جانے پہ اکساتی تھی؛ جبکہ یہ خاکسار تو اصل نسل راکھشسوں کو چکیاں مان کے خوش ہونا شروع کر دیتا ہے۔ یہ ہے بنیادی فرق مجھ میں اور کیہوتے میں۔

اہلیہ میری ان باتوں سے جل کے رہ جاتی ہیں۔ ظاہر ہے وہ (انگریزی محاورے میں) پھاوڑے کو پھاوڑا پکارنا پسند کرتی ہیں۔ اس رویے کے برخلاف، میرے لگشن (یا پچھن) وہ ہیں، جو خلد آشیانی اسداللہ خاں غالب کے تھے کہ جنھوں نے ''صاحب کے کف دست پہ'' چکنی ڈلی کو اس ''قدر اچھا'' دیکھا اور دکھایا تھا کہ کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

قصور الحمرا سے چلتے ہوئے ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے سمجھایا تھا کہ سان خورخے جانا خوب ہے، لطف آ جائے گا۔ بعد کو پرڈیوسر دوست کچھ پینکی پینکی (یا fishy) سونگھ کر اچانک ڈرائیور کی سازش میں شریک ہو گئے تھے۔ انھوں نے بہت سوکھے سے منھ سے ہدایتکار دوست کو اور مجھ ڈون کیہوتے کو یاد کرا دیا کہ یہ St.George یا ولی خورخے یا سنت گھور گھے، ممالک آئبیریا (Iberia) اسپین و پرتگال کی عظیم تاریخ کے اور کلچر کے مرکزی آدمی لگتے ہیں جیسے ہند فارسی کلچر کے اپنے امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔

بعد کو ہم ٹیگس دریا اور دارالخلافہ لزبن دیکھنے پرتگال پہنچے تو وہاں بلند ترین اکازر (القصر) کے دمدمے پر سان خورخے کا کانسی کا وہ پیکر بت دیکھا جو سامنے اٹلانٹک کی سمت سے آنے والے نورسنوں پر کڑی نظر ڈالتے ہوئے اپنی تلوار ٹکائے کھڑا تھا— بالکل میری ایک کہانی کے ڈکاروں والے مسند ریاض کی طرح، جسے کوٹھوں پر آنے والے گاہکوں کو دور سے scan کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔

تو سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑتا ہوں کہ جہاں میں نے سان خورسے کلب کی بیسواؤں کو بار پر ہجوم کیے دیکھ کر گمان کیا تھا کہ ہو نہ ہو اس صاحبِ آستانہ کا تعلق ملامتیہ فرقے سے ہے اور یہ اپنے ارادت مندوں کو پہلے مکروہات ونواہی کے سامنے لا کر چند در چند ممنوعات سے متعارف کراتے ہیں پھر ان کی اصلاح فرماتے ہیں۔

مگر یہ میری وہی بیان کی ہوئی بدعادت (یا معذوری) تھی۔ میں نے اصل دیوزادوں کو پھر یون چکی سمجھ لیا تھا۔ فی الحقیقت ہم ایک قحبہ خانے میں گلے گلے اترے ہوئے تھے۔ کہیں کوئی ولی دستگیر نہیں تھا۔

میں نے دل ہی دل میں کھلکھلاتے ہوئے کولرج کی مشہور نظم کی لائنیں دہرانی شروع کر دیں۔

Alone, alone,
All, all, alone,
Alone on a wide wide sea,
And never a saint took pity
On my soul in agony.

ادھر نیم روشن ہال میں کھڑے ہدایتکار دوست اپنی ٹیکسی ڈرائیور سے دِلّی آگرے کے محاورے میں بھنا کے پوچھ رہے تھے کہ ابے یہ کاں لے آیا؟؟

پومپیائی کا پہرے دار

دروازے کے قریب دیوار پہ لکھا تھا: ''امفیاندا سے پیار کرتا ہے پارتم نووس۔''

یہ چوبیس اگست کا دن تھا۔ خلیج نیپلز پر خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آسمان بالکل صاف اور خوب نیلا ہو رہا تھا۔ فیشن ایبل قصبے ہرکلانی یم کی اونچی بیکری والے نانبائی نے اپنی پیسٹریاں، ڈبل روٹیاں جمانی شروع کر دی تھیں۔ ڈبل روٹیوں پیسٹریوں پر نانبائی کے نام کا ''ایس پی'' چھپا ہوا تھا — یعنی سکستیس پاتونکس — برابر والے اسٹینڈ پر سبزی فروش نوفیرس اپنی سبزیوں اور پھلوں کو پانی کا چھینٹا مار رہا تھا۔ جواہر تراشنے والے نے کٹر سنبھال لیا تھا۔ وہ ایک خوش رنگ نگینے پر دیدہ ریزی کے ساتھ ابھرواں کام شروع کر چکا تھا (کیا خبر اس نے گاہک سے آج کا وعدہ کیا ہو)۔ پیتل کی ڈھلائی والا دکاندار ایک شمع دان کی مرمت میں لگا تھا۔

درزی، مصور، پھیری والے، سرائے کے مالک، سبھی برابر سے مصروف تھے۔ قصبے میں آنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ وہ یہاں کے وسیع و عریض پالیسترا (اسٹیڈیم) میں ہونے والے مقابلے دیکھنے آئے تھے۔ کھیلوں کے یہ مقابلے روما کے پہلے ایمپرر آگستس (سیزر) کی سالگرہ کے سلسلے میں ہو رہے تھے۔ گہما گہمی، ہلچل، ہنسی ٹھٹھے؛ ہر طرف میلے کا سماں تھا۔ لوگ ایمپرر کی سالگرہ منانے دور دور سے چلے آ رہے تھے۔

جی ہاں، چوبیس اگست کا دن تھا۔ سال اناسی (عیسوی)۔ حضرت مسیح کو گزرے ابھی پورے پینسٹھ برس نہیں ہوئے تھے۔

قصبے ہرکلانی یم میں جشن کا سماں تھا...

لیکن ہر کوئی جشن نہیں منا تا تھا۔ کچھ لوگ اپنی الجھنوں میں تھے۔ عظیم چوک پر تعمیر کی گئی آگستس کے نام سے منسوب قربان گاہ کے ایک کمرے میں، جس کی کھڑکی پر سلاخیں جڑی تھیں، ایک بلند مرتبت آدمی اسیری کی صعوبتیں جھیلتا تھا۔ اب تو کوئی بھی اس کا نام نہیں جانتا۔ نہ میں نہ کوئی اور۔ اصل میں یہ آدمی بس اتنا ہی ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ آدمی اس واقعے کا مرکزی کردار نہیں ہے۔

جواہر تراشنے والے کی دکان کے پیچھے کوٹھری میں لکڑی کے بستر پر ایک بیمار لڑکا پڑا تھا۔

کشتی گھاٹ پر چوڑے ہاڑ ہڈوں والے گٹھے ہوئے بدن کا ایک غلام اپنے درد کرتے رگ پٹھوں کو ایک اور کمر توڑ بوجھ کے لیے تیار کر رہا تھا۔

برابر کی حویلی میں چودہ برس کی ایک کھلائی، دس ماہ کے صحت مند بچے کو جیسے تیسے سنبھالتی تھی۔

(عرض کیا نا... کہ کچھ لوگ اپنی الجھنوں میں تھے)۔

اور ایسے میں — ایسے میں جناب والا! لوگوں نے ایک بے پناہ گڑگڑاہٹ سنی۔ زمین کو دہلا دینے والا ایک جھٹکا لگا اور اس کے بعد مسلسل گرج اور کڑک اور ابتلا۔

مشرق کی طرف چار میل دور آتش فشاں ویسوویس کے دہانے سے آگ اور گرم راکھ اور جھاگ کا ایک بھیانک ستون بلند ہونا شروع ہوا جو سولہ میل تک اٹھتا چلا گیا۔ اور سولہ میل کی اونچائی پر اس نے ایک کوہ پیکر گکرمتے جیسی چھتری کی شکل اختیار کر لی۔

اس کوہ پیکر گکرمتا چھتری کو بیان کرتے ہوئے — کہ جو نیپلز کے قریب کے قصبے ہرکلانی یم اور وہاں سے سات میل دور بسے مشہور شہر پومپیائی اور اس کے مضاف میں سن اناسی عیسوی میں دیکھی گئی تھی — آج میں اس نیوکلیائی گکرمتا چھتری کو یاد کرتا ہوں کہ جو آدمی پر آدمی کی لائی ہوئی اب تک کی سب سے بڑی اور پہلی نیوکلیائی ابتلا ہے — جس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آخری بھی ہو گی۔

تو جناب، میں نے، میرے ساتھیوں نے، گھر سے نکلنے سے پہلے بہت سے امنگوں بھرے

امکانات سوچ رکھے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ سیریل کی ریکی کا کام نمٹا کے کچھ سیر سپاٹا کیا جا سکتا ہے۔ ہم اسپین کے 'دارالخلافے' مادرد میں تھے۔ رات کا کھانا کھا کے بیٹھے تھے۔ اندالوسیا کے پانچ شہر جو ہمارے سیریل کی کہانی کی زد میں آتے تھے، یعنی: قرطبہ، غرناطہ، مالقہ، اشبیلیہ، تورے مالینوس... سب دیکھے اور نوٹ کیے جا چکے تھے۔ fairy-tale castles کا شہر سگوویا اور یونیورسٹی شہر سلامانکا خوب چھان پھٹک لیا گیا تھا۔ ہم پرتگال کے صدر مقام لزبن ہو آئے تھے اور مادرد شہر میں تیسری بار وارد ہوئے تھے۔ اپنے مطلب کا سبھی کچھ دیکھا جا چکا تھا کہ ناگاہ پروڈیوسر بھائی نے نوید سنائی:

''دوستو! سنو۔ زادِراہ کی تھیلی میں ابھی بھی سکے بجتے ہیں۔ واپسی کے لیے فرانس جانے سے پہلے کیوں نہ ہم اٹلی ہو آئیں۔'' پروڈیوسر بھائی نے گھر سے روانہ ہونے سے پہلے بھی اٹلی ''دیکھ رکھنے'' کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور کہا تھا، ''چلیں گے مگر شرط یہ ہے کہ زادِراہ اجازت دے'' اور ہم نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ بسم اللہ! پائے مرا لنگ نیست۔

سو اب سارے ہی کام نمٹ گئے تھے اور ہم نے ''یہاں کی مچھلی وہاں پڑی'' کہہ کے روما اور نیپلز کے سیر سپاٹوں کی تفصیل طے کرنا شروع کر دی تھی... تو میں، جو گھر سے پومپیائی کے مدفون (اور بازیافتہ) شہر پر خوب کام کر کے چلا تھا، اپنی بساط پھیلا کے بیٹھ گیا:

میں نے شہر پومپیائی اور قصبے ہرکلانی یم پر ان کے آتش فشاں ویسوویس کی لائی ہوئی مصیبت کا احوال سنانا اور علومِ آثارِ قدیمہ کے بے مثال کارناموں کا قصیدہ پڑھنا اور اپنا اور اپنے ان دو بھائیوں کا لہو گرمانا شروع کر دیا... کہ کس طرح ہمیں روم سے درگزر کرتے ہوئے سیدھے نیپلز پھر پومپیائی پھر ہرکلانی یم جانا چاہیے۔ روم تو سیاحت کی بساط کا پٹا ہوا مہرہ ہے۔ پرانا ہو گیا۔

اور یہ کہ ہمیں...

(مگر روم کہ Eternal City ہے۔ کبھی پرانا نہیں ہوگا۔)

— تو ہمیں پومپیائی کے بازیافتہ گلی کوچوں میں یسوع اور جولیس سیزر اور آگستس (اور شاید اووِڈ کی پرچھائیوں) سے کلام کرنے کا یہ موقع (اور شرف) اب حاصل کر ہی لینا چاہیے۔

میرے ساتھی کہنے لگے کہ دونوں سیزروں اور شاعر اووِڈ کو تمھارے بتائے ہوئے شہر پومپیائی

اور اس دوسرے قصبے سے زیادہ روم میں feel کیا جا سکتا ہے اور یسوع کا یہ ہے کہ وہ تو شہروں اور زمانوں کی حدوں سے کب کے نکل چکے، ان کی کیوں دُہائی دیتے ہو؟ اور سمجھو تو ویٹی کن سٹی بھی انھی کا ہے، انھیں وہیں feel کر لینا۔ میں نے کہا چلو ٹھیک ہے، آپ لوگوں کی ''شہروں زمانوں کی حد'' والی دلیل تگڑی ہے، مانے لیتا ہوں۔ ویٹی کن سٹی والی نہیں مانتا۔ وہ جگہ تو سمجھو ایک organised religion کی سیکرٹریٹ ہے۔ میں ہوا کی طرح آزاد عقیدت کا اور کسی بے لاگ آرادھنا کا قائل ہوں۔ تاہم ویٹی کن سٹی کی حدود میں ماسٹرز کے پینٹ کیے میورلز بھی ہیں اور دِلّی کی جامع مسجد جیسی سیڑھیاں بھی (سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دِلّی یاد آتی ہے)...اور بھی بہت کچھ ہے۔ بہتر ہے، روم پہ tick لگا دو۔ وہاں بھی ہو لیں گے۔

اس حجت بازی میں نہ معلوم کیوں میں اپنے ساتھیوں سے اصل بات نہ کہہ پایا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں پومپیائی دیکھنا چاہتا تھا— صرف اس لیے کہ اس شہر کی باقیات میں میرا ایک دوست مجھے مل سکتا تھا جس کی شبیہہ کوئی 58/57 سال سے میرے ساتھ ہے۔ یہ پومپیائی پر آگ کی بارش اور لاوے کے سیل میں اپنے نیزے کی ٹیک لگائے یقینی موت سے ایک بالشت دوری پر قدم جمائے کھڑے اس رومن سپاہی کی شبیہہ ہے جس سے سن پینتالیس چھیالیس میں میرا تعارف ہوا تھا۔

بتاتا ہوں کہ کیسے اس دوست سے ملاقات ہوئی تھی۔

میرے ابا بھوپال کے ایک صفِ اول کے اسکول میں آرٹ ماسٹر تھے۔ اسکول کے فائن آرٹس کے شعبے کو نواب کے ذاتی کتب خانے سے مصوری کی کتابوں کا عطیہ دیا جانا طے ہوا۔ اس شعبے سے متعلق کئی سو کتابیں تھیں جو نواب نے دنیا بھر سے اکٹھا کی تھیں۔ اب کہ ریاست کا چل چلاؤ تھا، نواب نے یہ نادر کتب اور ماسٹرز کی شاہکار پینٹنگز کے prints عوام الناس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے ابا چھ سات روز قصرِ سلطانی سے بھیجی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کتب خانے پہنچتے رہے اور اپنے طلبہ کے لیے کتابیں اور پرنٹس پسند کرتے اور اٹھوا اٹھوا کے لاتے رہے۔ شہر کا دوسرا ہائی اسکول، جسے اس عنایت سے نوازا گیا تھا، بروقت کتب خانے نہ پہنچ سکا...جب تک وہ لوگ پہنچتے میرے ابا ڈھائی تین سو نادر کتابیں اور کئی درجن اعلیٰ درجے کے پرنٹس اسکول کے فائن آرٹس کے شعبے میں

پہنچوا چکے تھے۔

کیا خزانہ ہاتھ آیا تھا۔

اسکول کی انتظامیہ نے دو فاضل الماریاں حوالے کر دیں۔ میں وہیں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ابا نے کہا، کتابوں کی کیٹلاگنگ کرنا ہے، پھر انھیں سلیقے سے الماریوں میں رکھنا ہے۔ دو دن کی چھٹی ہے، میں کتابوں کی درجہ بندی کرتا جاتا ہوں، تم اور فلاں فلاں طالبِ علم فہرستیں بناؤ اور سمجھا سمجھا کے دفتریوں کے حوالے کرتے جاؤ۔ وہ ہاتھ کے ہاتھ الماریوں میں جماتے جائیں گے۔ دو دن لگیں گے، کتابیں سب محفوظ ہو جائیں گی۔

ایسی نفیس و نایاب تصویروں کو اور چکنے مضبوط کاغذ پر چھپے مضامین کے ساتھ بیش قیمت جلد بندی والی کتابوں کو دیکھنا، چھونا اور جستہ جستہ پڑھنا میرے لیے اتنی بڑی مسرت تھی کہ اسے یاد کرتے اب بھی بدن میں سنسنی دوڑ جاتی ہے۔ لگتا ہے خون کی گردش تیز ہو گئی ہے۔

مصوری کے عالمی ورثے سے میرے چھوٹے موٹے تعارف کا زمانہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے میں اپنے باپ کا، اپنے اسکول کا اور نواب کے کتب خانے کا ممنونِ احسان ہوں۔

فہرست کی تیاری کا کام، جس طرح بتایا گیا تھا، ہم چار لڑکوں نے شروع کیا۔ کوئی آدھے گھنٹے ہم مستعدی کے ساتھ کیٹگری اور نمبر شمار اور نام کتاب کا یہ کھیل کھیلتے رہے، پھر ہم چار سے تین رہ گئے۔ میں نہ معلوم کس پل میں اپنا کام چھوڑ کے اور ایک کتاب سنبھال کے اک طرف جا بیٹھا تھا۔ مجھے بہت ساری تصویریں دیکھنا اور ان سے مسحور ہونا تھا اور ساتھ میں لکھی ان کی تفصیل جاننی تھی۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ کہاں ہوں اور یہ کہ یہیں قریب ہی ابا موجود ہیں... الماری کی اوٹ میں ایک ڈیسک میں دھنسا بیٹھا تھا کہ مجھ پہ ابا کی نظر پڑی۔ میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ابا ڈسپلن قائم رکھنے والے باپوں اور استادوں میں سے تھے اور کسی طرح کی بھی کام چوری برداشت نہیں کرتے تھے۔ مگر اس روز میرا انہماک دیکھ کے وہ مسکراتے رہے، کچھ نہ بولے۔

میں مصوری کے دو شاہکاروں، ڈاونچی کے The Last Supper سے اور کسی کم معروف مصور کے 'پومپیائی کے پہرے دار' سے اس روز پہلی بار متعارف ہوا۔

نویں جماعت میں تھا تو پہلے اس شہر کی بربادی کی کہانی پڑھی ہوگی۔ پھر کہیں سے عہدِ قدیم کے ہیروز کے قصے ہاتھ آئے ہوں گے تو اس شہرِ مدفون سے صدیوں بعد بازیافت ہونے والے رومن سپاہی کا حال پڑھا ہوگا کہ جو اپنی جگہ پر ہی پتھر ہو گیا مگر پہرے کی جگہ سے ہٹا نہیں۔

آج میں یہ تصویر دیکھ رہا تھا۔

اور اب ایسا ہے کہ سو بار کی دیکھی ہوئی اس پینٹنگ کو جزئیات کے ساتھ میں آج بھی بیان کر سکتا ہوں:

خزانے کے بند آہنی دروازے کے آگے کھڑا رومن پہریدار اپنا سر اٹھائے میلوں دور دکھائی دیتے ویسوویس کے جہنم دہانے سے فوارے کی طرح چھوٹتے اس دہکتے ہوئے ستون کو دیکھ رہا ہے (جو ماہرین کے شمار اور تخمینے کے مطابق فضا میں سولہ میل تک اٹھا تھا اور گرمتا چھتری بناتا بستیوں پر آن گرا تھا)۔ اس جاں سپار کے خود اور چار آئینے پر اور اس کی پتلیوں کے فولاد پر سرخ و نارنجی جہنم زار کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ لاوے کا لہو رنگ گاڑھا دریا کا بلی کے ساتھ بہتا ہوا قدموں تک آ گیا ہے، اس کی تسموں سے بنی پاپوش سے بالشت بھر دور ہے۔ یہ جواں سال دانتوں پر دانت جمائے بے خوفی —اور ایک نوع کے abandon کے ساتھ— قدم جمائے کھڑا ہے۔ لانبے نیزے پر جمے ہوئے پنجے کی گرفت، جبڑوں اور بازوؤں کے پٹھوں اور نسوں کا تناؤ اس کی فولاد پہنی چھاتی میں کسی دھڑکتے دل کا پتا دے رہا ہے— دل جو ایک فطری خوف سے بہرحال جوجھتا ہوگا۔

ابا کہنے لگے کہ مصور نے سپاہی کی آنکھوں کو اور اس کی گرفت کو define کرتے ہوئے ایک ناموجود خوف کا موجود ہونا دکھا دیا ہے۔ اور میاں! یہی اس پینٹنگ کا جواز اور اس کا کلائمیکس ہے۔ ایک زندہ انسان کی تصویر کشی کی ہے اس نے، کسی مردے کا یا مشین کا فوٹو نہیں کھینچا ہے۔

ہم باپ بیٹے (خدا ہم دونوں کی مغفرت فرمائے) paintings کو پڑھنے، ان کو ''دُور تک جا کے'' سمجھنے کا یہ کھیل خوب کھیلتے تھے۔ میرے لیے تو یہ کھیل ہی ہوتا تھا۔ ابا کے لیے یقیناً یہ کسی طرح کی exercise in Aesthetics ہوگی۔ کتنے ہی شاہکار (یعنی ان کے پرنٹس) ابا گھر لے آتے تھے اور بلا تامل انھیں سامنے رکھ کے سمجھتے اور سمجھاتے تھے Judgement of Paris. Birth of Venus.

The Naked Maja... اور بھی بہت سی پینٹنگز ہمارے (اس وقت کے/ شاید آج کے بھی) مسلم، مڈل کلاس گھروں میں taboo تھیں۔ کھلے عام آویزاں کرنا رہا ایک طرف، ان تصویروں کو میز پر پھیلا کر بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ مگر ہمارے بڑے کمرے میں شاہکاروں کو سمجھنے سمجھانے کا یہ سیشن برابر چلتا رہتا تھا۔ گھر بھی حسبِ معمول اپنی رفتار سے چلتا رہتا۔ ایک بار کے سوا کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ میرے تایا صاحب نے ایک دفعہ کچھ تصویریں دیکھ لی تھیں تو ابا پر بہت خفا ہوئے تھے کہ میاں! یہ انبیا علیہم السلام کے نام کی شبیہیں اور بے لباس مردوں عورتوں کے فوٹوگراف تم گھر اٹھا لاتے ہو۔ ذرا بھی خیال نہیں کرتے... وغیرہ۔

آدمی کتنے ہی لوگوں کے ساتھ زندگی کرنا چاہتا ہے، مگر یہ پورا پھیلاوا کچھ اس طرح کا ہے کہ ایسا ہو نہیں پاتا جیسا آدمی چاہتا ہے — عین مین اس طرح — بالکل اسی طرح نہیں ہو سکتا۔

خیر۔ میں نے ویسوویس کی آتش فشانی سے برباد ہوئے ایک قصبے، ہرکلانی یم کی باقیات سے اپنے بیان کی ابتدا کی تھی... کہ وہ چوبیس اگست کا دن تھا۔ خلیجِ نیپلز پر خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آسمان صاف اور خوب نیلا ہو رہا تھا... کہ زمین کو دہلا دینے والا ایک جھٹکا لگا اور مسلسل گرج اور کڑک کے ساتھ ابتلا آغاز ہوئی اور ویسوویس کے جہنم دہانے سے فوارے کی طرح چھوٹتا آگ اور گرم ترین راکھ اور جھاگ سے بنا ایک دہکتا ہوا ستون فضا میں سولہ میل تک اٹھا اور لگر متا بکھرتی بنا تا بستیوں پر آن گرا۔

صبح کا وقت ایک نحوست آثار جھٹپٹے میں بدل گیا...

سورج کے بڑے حصے پر پردہ پڑ گیا تھا۔

اس قصبے کو اٹھارھویں صدی کے آغاز میں کھود کر نکالا گیا تو کھنڈروں کی باقیات میں کتے، بلیاں، چوہے (جو عام طور پر بھاگ ہی جاتے ہیں) نہ مل سکے۔ ہرکلانی یم کے لوگ (اور کتے بلیاں چوہے) شروع کے جھٹکوں اور گرج کڑک سے دہشت زدہ ہو کے بھاگ کھڑے ہوئے ہوں گے۔ زلزلے کے جھٹکوں اور گندھک کی بو کے ہوتے بھی بہت کم راکھ قصبے پر برسی۔ لیکن دھوئیں اور راکھ اور جھاگ کا ایک کوہ پیکر بادل سات میل جنوب میں بسے (20 ہزار آبادی کے) شہر پومپیائی کی طرف بڑھتا ہوا دکھا گیا۔ دوپہر ہوتے ہوتے پومپیائی شہر کے پناہ گیروں کے ہجوم کے ہجوم بہت خوف اور

پریشانی میں، شمال کی طرف جانے کے لیے، ہرکلانی یم کی سڑکوں گلیوں سے ہڑبڑاتے گزر رہے تھے۔شمال میں نیپلز کی بندرگاہ تھی۔اور عافیت تھی۔ یہ بھاگنے والے اپنے شہر پر برستی ہوئی آگ اور راکھ کے بارے میں بتاتے جاتے تھے۔ بہت سے لوگ اس خیال سے کہ اگر ہوا کا رخ بدل گیا تو یہ قصبہ بھی پومپیائی کی طرح برباد ہو جائے گا، ہجوموں کے ساتھ نیپلز کی طرف نکل گئے۔نیپلز پہنچ کر وہ اس شہر ناپُرساں کے ایک حصے میں، جو آج بھی ''ہرکلانی یم کوارٹرز'' کہلاتا ہے، جا بسے۔

میں نے مثال دے کر سمجھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''جیسے کسی کو کراچی آنا پڑے اور سمجھو وہ اپنی یادوں کی اسیری میں علی گڑھ کالونی، یا بنارس بنا کے بیٹھ جائے۔''

(ہدایتکار نے گھور کے دیکھا: ''بڑے بھائی! کراچی کا یہاں کیا ذکر؟'' میں نے سوچا، اپنے شہر سے محبت کرتے ہیں۔انھیں یہ حوالہ بدشگونی جیسا لگا ہے، sorry)۔

اور پھر رات ہوگئی۔ لاوے کا گاڑھا دریا مسلسل بہتا تھا اور آتش فشاں کے دہانے سے جلتی ہوئی گیسیں مرغولے بناتی فضا میں دور دور تک اٹھتی تھیں۔

جو بہت ہی ڈر گئے تھے ساحلِ سمندر پر جا بیٹھے کہ اگر حالات اور خراب ہوئے تو ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے نکل جائیں گے یا کشتیوں میں بیٹھ ہجرت کر جائیں گے۔بعضوں نے شہر پناہ کو ٹکائے رکھنے والی کمانوں محرابوں میں پناہ لی۔انھوں نے سوچا ہوگا یہاں ٹھیک رہے گا، بالکل آگے سمندر جو ہے [سوان کے پتھرائے ہوئے جسد کہیں اٹھارہویں صدی گزرنے کے بعد کھدائی میں برآمد ہوئے — سمندر فرلانگوں پیچھے چلا گیا تھا۔لاوے نے لینڈ ماس (real estate?) بڑھا دیا تھا]۔

تو بھائی، آدھی رات کا گجر بجا، اگست کی پچیسویں تاریخ ہوئی، اور کچھ ہی دیر بعد آتش فشاں کے دہانے سے میلوں کی بلندی تک پہنچا ہوا، قیامت کی آگ اور راکھ اور سنسناتے ہوئے جھاگ کا وہ ستون — گھومتا چھتری بنا تازمین پر آن گرا۔انا للہ وانا الیہ راجعون! یہ خاتمہ تھا۔

ہوا میں اور آتش فشائی گیسوں میں خوب پھینٹا گیا super-heated جھاگ اور راکھ کا ملغوبہ شہر کی طرف ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے لپکا۔اس کی حدت کا اندازہ ماہروں نے سات سو چھتر درجے فارن ہائٹ لگایا ہے۔احفظنا!

جان بچانے کو تھوڑی سی مہلت ملی تھی۔ سو ہرکلانی یم والے جو بستی میں رہ گئے تھے ساحل تک پہنچنے کو دوڑے۔ مگر دہشت کی اس ہڑبڑی میں، جوہری کی دکان کی کوٹھری میں لیٹا ہوا وہ بیمار لڑکا، اور آگستس سے منسوب قربان گاہ کے کمرے میں اسیری کی صعوبتیں جھیلتا عالی منصب قیدی اور بھی کچھ بے چارے، جنھیں لوگ... بس بھول گئے تھے... ایک نہایت تکلیف دہ موت (اور ایک احمقانہ جسمانی ہمیشگی) بھگتنے کو پھنسے رہ گئے۔

اس مقہور بستی پر سے آگ کا ایک بے پناہ سیل گزرا۔ وہ اپنی لپیٹ میں بہت کچھ لیتا ہوا ساحل آب تک پہنچ گیا۔ پھر دوسرا ریلا آیا جو پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک اور تباہ کن تھا۔ اس نے چھتیں اڑا دیں اور دیواریں گرا دیں۔ پھر دالانوں، اساروں اور چھتوں اور دیواروں اور سب چیزوں کو کچرے کی طرح سمیٹتا ہوا وہ سمندر میں اتر گیا۔

ویسوویس جب انیس گھنٹے بعد خاموش ہوا تو یہ قصبہ چھیاسٹھ فیٹ موٹی، بہت سیاہ اور چٹان کی طرح سخت کھرنڈ سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ کھرنڈ ایسی تھی کہ عام اوزاروں کے بس کی نہیں تھی اس لیے جب 1709 عیسوی میں کنووں کے جیسے shafts نچلے طبق میں اتارے گئے تو بس ایک قدیمی "تھی ایٹر" کے اسٹیج تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی۔ وہاں سے بمشکل ماربل کے چند slabs اور یونانی اور رومی مجسمے ہاتھ آئے۔ اگلے پچاس برسوں تک کنویں کھودنے کا (اور چوری چکاری کا بھی) سلسلہ جاری رہا، پھر بند ہو گیا۔ کیونکہ لوگوں کی توجہ دوسری طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ قریب کے شہر پومپیائی پر پڑی راکھ اور لاوا آسانی سے ہٹایا جا سکتا تھا۔

ہرکلانی یم سے کلاسیکی فن کے جو نوادر مختلف اشیا کی صورت میں برآمد ہوئے تھے ان سے، بہرحال، اس وقت کی عمارتوں اور فرنیچر اور کپڑوں کے ڈیزائن متاثر ہوئے اور کچھ رونق آ گئی۔ واقعے کو انیس سے زیادہ صدیاں گزر گئی تھیں اور کھدائی میں بس اسی طرح کی چیزیں نکل پائی تھیں۔ کھودنے والوں نے اب جو پومپیائی پر توجہ دینی شروع کی تھی تو بیس فیٹ موٹی راکھ کی دولائی کے نیچے سے بہت سی چیزیں نکلی تھیں۔ پر میرے 'دوست' پومپیائی کے پہریدار کے سوا آدمی کوئی نہ نکلا تھا۔ شہر کی تباہی سے پہلے ہی سب ہرکلانی یم، یا اور آگے، نیپلز میں پناہ لے چکے تھے۔

پھر اٹھارہویں صدی کے کسی مصور نے پہریدار کے نیزہ تھامے، پتھر ہوئے جسد کو دیکھا اور paint کیا اور میرے ابا نواب کے کتب خانۂ خاص سے وہ کتاب پسند کر لائے جس میں اس بے مثل کینوس کا پرنٹ موجود تھا۔ اس وقت تک میں ''عہدِ قدیم کے ہیروز'' نامی کتاب میں پومپیائی کے پہریدار کا قصہ پڑھ چکا تھا۔ اور پھر، جیسا کہ بیان کر چکا ہوں، میرے باپ نے اس پینٹنگ کے محاسن سے مجھے روشناس کرایا۔ اور اب ـــ نئے ملینیئم کے اس جون مہینے میں، میں، اسپین کے دارالخلافے مادرد میں بیٹھا اپنے دوستوں کو آمادہ کر رہا تھا کہ یارو! نیپلز چلو اور پومپیائی کے اس جواں مرگ ساونت کو دیکھو۔ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔

''ایسے موقعے'' میں نے خود سے کہا، ''ایک نسبتاً چھوٹے شہر کے average طالب علم کے بے ماجرا لڑکپن میں... کب آتے ہیں... ایسے موقعے؟... کہ اسے ایسی کوئی کہانی پڑھنے کو ملے، اور ایسا کوئی شاہکار دیکھنے کو ملے، اور طالب علم کو وہ مصور باپ ملا ہو جو تصویر کو اس طرح سمجھ اور سمجھا سکے۔''

میں ان سب opportunities، ان سب نوازشوں، عنایتوں، بہرہ مندیوں کے لیے وقت کا شکر گزار ہوں کہ جس کی کیمسٹری نے کسی سمجھ میں نہ آنے والے عمل کے دوران بہت سے واقعات بظاہر ایک بے ترتیبی سے اوپر تلے رکھ دیے؛ جس سے وہ سب ہوتا چلا گیا جو میرے لیے اچھا، بہت اچھا تھا۔ اور جو میرے سان گمان میں بھی نہ تھا۔

یقین کیجیے ایسا نہ ہوتا تو کچھ اور ہو جاتا۔ برا، بھلا، بہت برا، یا نیوٹرل۔ گویا میرے ساتھ یا کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ، مثلاً میری سوچی ہوئی اس analogy میں ابھی ابھی عترت حسین زیدی کے ساتھ ہوا (عترت حسین زیدی میری فکشن کا ایک فرضی کردار، ایک بھلا آدمی ہے جسے ضرورت کے مطابق میں اپنی کہانیوں میں لاتا لے جاتا رہتا ہوں)۔

تو ع ح زیدی کے ساتھ یا کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے ـــ ابھی بس اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں میں۔

میں وقت کے آمرانہ رویے پر ایک مثال دے کر خود کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ میں اپنی زندگی

جی رہا ہوں۔ وقت اپنی رفتار سے چل رہا ہے۔ اس کی رفتار کسی نہ کسی ترتیب کی پابند ہے بھی اور نہیں بھی ہے، یعنی وقت اس بات کا ہرگز مکلف نہیں ہے کہ میری گزرتی ہوئی زندگی کو اپنے ساتھ جوڑتا ہوا، اسے compatibility دیتا ہوا چلتا رہے (دیکھیے نا، وہ کسی سے کسی طرح کی بھی مروت کیوں کرنے لگا؟) وہ میری analogy کے مطابق بھی کرسکتا ہے۔ گویا کچھ اس طرح ہوسکتا ہے کہ:

[الف خان ٹاور کی بس میں بیٹھا صدر کی طرف جاتا تھا کہ ناگاہ اس نے اس حرام الدہر ب کو دیکھا جو اسی بس سے کینٹ اسٹیشن جا رہا تھا (جہاں سے اسے گاڑی پکڑ کے مردان کی طرف دفع ہو جانا تھا)۔ قبل اس کے کہ الف خان اس خدائی خوار بس سے اتر کے فرار ہوتا اور ہجوم میں شامل ہو جاتا، ب نے اسے دیکھ لیا اور نیفے سے ٹی ٹی نکال الف خان کو...

[یہاں ب کا نشانہ چوکتا ہے۔ مسافر... میرا دوست عترت حسین زیدی حادثاتی طور پر مارا جاتا ہے)۔ انا للہ...]

ع ح زیدی کے سب کام دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس کے بیٹے کو ایف آر سی ایس چھوڑ کے کراچی واپس آنا پڑتا ہے جہاں اس کی بہن کے سسرال والے ہیں۔

...اور جہاں اب ایک pre-meditated حرام زدگی شروع ہو جاتی ہے۔ کم سے کم بارہ آدمیوں کی زندگی کا ڈھرا بدل جاتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ نکالا جائے کہ ایک ہارڈ ڈسک پر پہلے سے، بہت پہلے سے، ایک software ترتیب دیا رکھا تھا کہ اس روز اس بس میں وہ خرکوز یہ ب بیٹھے گا اور الف بھی سوار ہوگا۔ جبکہ عترت حسین زیدی کو دفتر میں بیٹھے بیٹھے خیال آئے گا کہ جتنی دیر میں ڈرائیور کمپنی کی گاڑی سروس کرا کے لاتا ہے کیوں نہ وہ برنس روڈ سے مٹھائی کے سربند ڈبے خرید کے رکھ لے۔ ورنہ ہوسکتا ہے کمپنی کی گاڑی کو ادھر سے نہیں ادھر سے نکلنا پڑے اور ع ح زیدی ڈبے نہ خرید پائے (بھئی، بیٹی کی ہونے والی سسرال کا معاملہ ہے)۔ تو بس۔ یہ سوچ کے وہ دو اسٹاپ سفر کرنے کی نیت سے اس بس میں بیٹھنے لگے گا جس پر الف اور ب پہلے سے موجود ہوں گے۔ تب وہ پیرکش، ب، اپنے نیفے سے ٹی ٹی نکالے گا اور

...نہیں جناب! اس میں قضائے مبرم جیسا کچھ نہیں تھا یعنی ایسا کچھ نہیں تھا جو Supreme Being

نے پہلے سے طے کر رکھا ہو کہ یہی ہوگا اور اس کے سوا نہیں ہوگا۔

کہیں کوئی ہارڈ ڈسک نہیں تھی ... کوئی software موجود نہیں تھا۔ یہ وقت کی کیمسٹری تھی جو اپنے ہی کسی اصول اور اپنی ہی کسی خود رو بے ترتیبی سے اٹھی تھی اور جیسا بھی اس سے سرزد ہوا، اس نے وہ سب کر کے رکھ دیا اور یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ایسا ہو جائے گا— ایک ٹی ٹی کی وجہ سے۔

میرے اس اُناسی عیسوی کے قصبے ہرکلانی یم کے سلسلے میں بھی کہیں نیفے میں اڑس کے چھپائی گئی ٹی ٹی جیسا ایک فیکٹر موجود تھا۔

وہ تھا آتش فشاں ویسوویس!

جس نے جواہر تراشنے والے کی دکان کے پیچھے کوٹھری میں پڑے بیمار لڑکے کو ٹھیک سے ناشتا بھی نہ کرنے دیا۔ لڑکے کے بستر کے سرہانے ایک طشتری میں مرغ کی تلی ہوئی اور پتھر بنی ہوئی ٹانگ رکھی تھی۔ (آدھے گھنٹے پہلے ماں آئی ہوگی، ''لے میری جان! تیرے لیے لائی ہوں۔ لے کھا لے۔ کچھ بھی تو نہیں کھاتا۔ باپ کے ساتھ لگا لگا چلا آتا ہے۔'')

اور ایک دروازے کے برابر دیوار پہ لکھی وہ graffiti کہ، ''امفیاندا سے پیار کرتا ہے پارتم نووس'' (میں نے اسی فقرے سے اپنی یہ کہانی آغاز کی ہے)۔

Aah! عشق! یہ خانہ آباد کبھی بھی ظہور کرے، کہیں بھی ظہور کرے، کوئی نہ کوئی جتن کر کے، مُنی پہ چڑھ کے اپنی بانگوں سے سب گلیاں چوبارے بھر دیتا ہے کہ ''ارض و سما سنو سنو''...

تو ساحل پر، اور الٹی پڑی کشتی کے برابر، اور دکانوں اور دستکاروں کے ٹھیوں پر اور نانبائی کے تنور میں وقت یوں ٹھیر گیا تھا کہ اسے دیکھا جا سکتا تھا۔ oven میں پوری اسی ڈبل روٹیاں لگی تھیں۔ ان روٹیوں، پیسٹریوں پر نانبائی کے نام کا ''ایس پی...'' ''سکستیس پاتوکس... چھپا ہوا تھا۔ وہ نگینہ جس پر جوہری کام شروع کر چکا تھا، اوزاروں کے برابر پڑا اُرلتا تھا کہ جوہری بے سوچے سمجھے بھاگ اٹھا تھا۔ اندر کوٹھری میں پڑا بیمار بیٹا بھی یاد نہیں رہا تھا اسے۔

پیتل کی ڈھلائی والا کاریگر مرمت کے لیے آئے شمعدان کو جہاں کا تہاں پھینک کے دوڑ گیا

تھا (جی نہیں! — '' جہاں کا تہاں '' نہیں۔ یہ شمعدان اس کی بیٹھنے والی تپائی پہ پڑا تھا۔ گھبراہٹ میں وہ اٹھا ہوگا، شمعدان اور ہتھوڑی تپائی پہ ڈالی ہوگی اور نکل لیا ہوگا)۔

ہرکلانی یم کی تفصیلی کھدائی میرے پیدا ہونے سے آٹھ برس پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت تک compressed-air برمے، بجلی سے چلنے والے اوزار اور بلڈوزر بھی آ چکے تھے۔ کھدائی کا کام اس بار آثارِ قدیمہ کے ماہروں کے سپرد تھا۔ خزانے ڈھونڈنے والے طالع آزما بھائیوں کو اس جگہ سے پچاس (یا زیادہ) قدم دور بھیج دیا گیا تھا۔

آج ... میں عرض کرتا ہوں کہ، آج اس قصبے کے سولہ بلاکس لاوے کی لوہا لاٹ چٹانوں کو chip off کر کے (گویا بڑی دیدہ ریزی سے '' سادہ کاری'' کرتے ہوئے) بازیافت کیے جا چکے ہیں۔ ان سولہ بلاکوں کی اکثر عمارتیں، پتھر جڑے کھڑنجوں والی گلیاں، فورم اور باسیلیکا جس میں انتظامی دفاتر اور کچہریاں تھیں اور پالسترا کا آدھے سے زیادہ میدان (جہاں آگستس کی سالگرہ کی خوشی میں کھیلوں کے مقابلے ہو رہے تھے) نکالا جا چکا ہے۔ عمارتیں ... اور ان میں پھنسے رہ گئے لوگ، ان میں پڑا سامان، سب اس لیے محفوظ (اور پتھر) ہو کر رہ گئے کہ آتش فشاں کا جاری کیا ہوا پگھلا مادہ سب میں بھرتا چلا گیا تھا — اور چیزیں اور لوگ '' ہوابند'' ہو گئے تھے۔

اس قصبے میں جانا بالکل ایسا ہے جیسے ہم نے کسی غیر مرئی دیوار کے پار ایک TIME WARP میں چھلانگ لگا دی ہو۔

سانکل کنڈے، اپنے کھانچوں میں سٹے ہوئے، اب بھی گھومتے ہیں۔ پانی کے ذخیروں میں لگی جستی ٹونٹیاں اشارے سے کھلتی بند ہوتی ہیں۔

رسوئی گھر میں برتن بھانڈے، دھلے دھلائے موجود ہیں۔ کوئلے کے چولھے پر ایک تسلا چڑھا ہے۔

ایک خوابگاہ میں مرمر کے تختے پر کنگھے اور آرائش جمال کا سب سامان پڑا ہے — کنگن، انگوٹھیاں، ہنسلیاں اور بروچ۔ آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے ...

اور صاحبو! اب یہ ہے کہ اللہ ہی اللہ ہے۔

o

مادرد میں پہلی بار آئے تھے تو ایئرپورٹ پہ اچھی انگریزی بولتا ہوا اور عرب بھائیوں جیسا دکھائی پڑتا ایک ہوٹل ایجنٹ کچھ ''اہلاً وسہلاً'' جیسا بدبداتا ہوا جھپٹ کے بڑھا تھا اور ہمیں بٹھا کے، سامان جما کے، اپنا کارڈ پکڑا کے چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے ٹیکسی والے سے کہہ گیا تھا کہ میرے دوست ہیں یہ دونوں، انھیں خیال سے لے جانا، ستانا مت۔

وہم سا ہوا تھا کہ وہ جو ہم سے کہہ رہا تھا کہ وہ آدھا اسپینی، چوتھائی افریکن، چوتھائی عرب ہے ...تو کہیں یہ جپسی تو نہیں ہے؟ ہدایتکار دوست کہنے لگے کہ بڑے بھائی! جپسی ہے تو ہوا کرے، ہمارا کیا بگاڑ لے گا؟ میں نے کہا نہیں نہیں، بگاڑے گا کچھ نہیں۔ سنوار دے گا۔ ''بھائی! یہ جپسی خانہ بدوش بڑے مزے کے لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے دسویں جماعت میں پڑھا ہوا انگریزی نثر کا ایک سبق یاد آ رہا ہے جس میں خانہ بدوشوں کے رومان کو بڑے پراثر انداز میں بیان کیا گیا تھا۔'' ہدایتکار بولے کچھ نہیں، مسکرانے لگے۔ مسکراہٹ میں ان کی ایک پورا جملہ تھا جس میں مجھ سے کہا جا رہا تھا کہ بڑے بھائی، واپس آ جاؤ۔ دسویں جماعت کے اسباق بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

خیر، میں نے دل میں کہا، ''اپنا اپنا خیال ہے۔ میرے حساب سے تو کوئی چیز، کوئی بھی چیز، جسے ہم تازہ رکھنا چاہیں پیچھے نہیں رہتی۔ ساتھ ساتھ چلی آتی ہے۔''

جیسے نوعمری میں دیکھی ہوئی ایک فلم Loves of Carmen (جو مجھے یاد پڑتا ہے، خانہ بدوشوں کے بارے میں تھی) یا بمبئی میں بنی اور بھی درجن بھر فلمیں جن میں سر سے قزاقوں والا رومال باندھے، کانوں میں کنڈل پہنے، راج کپور کا چپٹی ناک والا بہنوئی دف بجا بجا کے گاتا رہتا ہے...آج تک گا رہا ہے۔

ٹیکسی جس ہوٹل تک لے کے پہنچی وہ ہمیں سستا اور سکڑا سمٹا سا لگا۔ وہ مادرد کی شاہراہ عظیم (ویا گران) سے ٹھیک بیس قدم دور، اندر کہیں ایک تنگ گلی میں پھنسا ہوا بیٹھا تھا۔

ٹیکسی کے جاتے ہی، ہوٹل کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے ہدایتکار دوست نے کہا، ''وہ ایئرپورٹ والا ایجنٹ مجھے ایک بار مل جائے۔''

بات اتنے رسان سے کہی گئی تھی اور اس طرح لہجہ بنا کے کہی گئی تھی کہ میں سمجھا نہیں۔ میں ان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا، سو تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا کہ بھائی جان! ملے گا انشاءاللہ ضرور ملے گا۔

انھوں نے اب کے دانت پیستے ہوئے کہا: ''بس بڑے بھائی! ایک بار اور مل جانے دو...''

مسکرانے کی باری اب میری تھی۔ انھوں نے دیکھا۔ کہا کچھ نہیں۔ پھر خود بھی تھوڑا مسکرانے لگے۔

ہم بہرحال ہوٹل میں داخل ہو گئے۔

ریسپشن پہ بیٹھا اکیلا نوجوان اپنے چمکدار دانتوں کی نمائش کرتا ہوا آگے آیا۔ اس نے ہمارا سامان اٹھایا، سلیقے سے کاؤنٹر کے برابر رکھا، پھر وہ خود اندر کاؤنٹر میں پہنچا، اپنی کرسی پر ایک بار ٹکا، پھر فوراً ہی ''ویلکم'' کہتا اٹھ کھڑا ہوا، اور اتنی تیزی سے کہ جیسے آموختہ سنا رہا ہو، اپنے ہوٹل کے محاسن بیان کرنے لگا کہ — عین شاہراہِ عظیم الشان پر واقع، ہمارا یہ ہوٹل آپ اپنی جگہ ایک legend کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہوٹل وہ ہے کہ جہاں Faboulous Martha نے (جو خدا معلوم کون تھی) پورے چھ مہینے قیام کیا ہے۔ عظیم لارنز و (Lawrence of Arabia کو کہتا ہوگا) کے سب دوستوں، سب داشتاؤں کا پسندیدہ ہوٹل پورے مادرِد میں اگر کوئی ہے تو یہی ہے۔ یہی وہ ہوٹل ہے جہاں ''جینی رل'' فرانکو نے اپنے بریگیڈ کو، جب وہ مشکلات میں گھرا ہوا تھا...

''ایک منٹ!'' ہدایتکار دوست نے کہا، ''ایک منٹ! کیا وہی جینی رل فرانکو تھا جو ہمیں ایئرپورٹ پر ملا تھا؟ جس نے ہمیں یہاں بھیجا ہے؟ اگر وہی تھا تو میرے عزیز! Believe you me ...وہ اس وقت بھی مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ بی لیو یو می!''

پہلے تو ریسپشنسٹ کچھ نہیں سمجھا، پھر ہدایتکار دوست کے ایک بار اور دانت پیسنے اور میرے دوبارہ کھلکھلانے پر سمجھ گیا کہ کیا قصہ ہو سکتا ہے۔

وہ پہلے ایکسکیوزمی کہہ کے مسکرایا، پھر ہنستے ہوئے کاؤنٹر سے باہر نکل آیا (دوبارہ اندر نہیں گیا) اور بتانے لگا کہ اگر آپ لوگ کسی Aa-rab کنٹری سے آئے ہو یا مسلم ہو تو میرا پوائنٹ آپ جلدی سے سمجھ لوگے۔ ویسے بھی ینگ لوگ کوئی ریگولر Job نہ کر رہے ہوں student ہوں اور انھیں every now & then نئے سمسٹر کی فیسیں دینا ایک دم ضروری ہو تو تھوڑا سا جھوٹ بولنے... یا سچ کو ذرا سا

stretch کر لینے کی اجازت دے دینی چاہیے۔ ?What do you say, Sir۔اس نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے کہا کہ ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا اس لیے کہ میرے دوست کو تمھارے اس ''جپسی'' دوست پر بہت غصہ ہے۔

''جپسی؟'' اس نے ضرورت سے زیادہ حیران ہو کر سوال کیا اور بولا:

"He is no gypsy. Sir! He is a Muslim...from Morocco."

ہدایتکار نہال ہو گئے۔ ''المسلم؟ المراکش؟''

"Yea Yea, El-Moslem. El-Murrakesh."

نوری اور پیدرو ـــ اور اساتذہ کی دو کہانیاں

ہم مادرد اسپین میں تھے۔ میں نے ہوٹل ریسپشنسٹ کو بتایا تھا کہ میرے دوست کو تمھارے اس 'جپسی' دوست پر بہت غصہ ہے۔

''جپسی؟'' اس نے بہت حیران ہو کے پوچھا، ''جپسی؟'' پھر کہنے لگا "He is no gypsy

Sir! He is a Muslim... from Morocco."

ہدایتکار نہال ہو گئے۔ ''المسلم؟ المراکش؟''

"Yea Yea, El-Moslem, El-Murrakesh."

ریسپشنسٹ پھر دانت کھول کر مسکرایا اور پوچھنے لگا کہ آپ لوگوں کو میرے مراکشی دوست کی کیا بات بری لگی ہے؟ بتایئے، میں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

ہدایتکار اب مسکرا رہے تھے۔ نفی میں سر ہلا کر بولے، ''نہیں نہیں، کچھ نہیں۔ کچھ برا نہیں لگا۔''

ہوٹل والے کا کہنا تھا کہ نہیں کوئی بات ہے ضرور۔ ہدایتکار دوست بولے، ''برادر! چھوڑیے اب تو ساری سچویشن ہی بدل گئی ہے۔ اس لیے کہ آپ لوگ student ہو۔ باہر سے آئے ہو اور روزی کمانے، فیسیں اکٹھی کرنے میں لگے ہو اور بھیا! ہوٹل بزنس کا تو یہی ہے کہ تھوڑا بہت جھوٹ spice کی طور پر ڈالنا ہی پڑتا ہے۔ ہاہاہا!''

ریسپشنسٹ نے یہ بات پسند کی اور ہمیں ہوٹل کے سب سے آرام دہ کمرے میں پہنچانے کے لیے سامان اٹھا کر آگے آگے چل پڑا۔ اس نے ایک وضاحت ہاتھ کے ہاتھ کر دی تھی کہ وہ خود طالبِ علم نہیں ہے، مقامی ہے اور رومن کیتھولک ہے اور یہیں مادرید کی بُل فائٹنگ اکادمی میں زیرِ تربیت ہے۔

''ار...رے رے! تم بُل فائٹر ہو؟'' ہم دونوں نے رستے میں رک کے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

وہ کھسیا کے بولا، ''ہوں نہیں ... بننا چاہتا ہوں۔ ٹریننگ کا پہلا سال ہے۔ ابھی ٹھیک گیارہ مہینے ہوے ہیں۔''

''اور تمھارا دوست؟ وہ مراکشی؟ وہ بھی بُل فائٹنگ سیکھ رہا ہے؟'' میرے دوست نے بہت ارمان بھری آواز میں پوچھا۔

''نہ نہ! وہ Applied Chemistry میں ڈگری کر رہا ہے۔''

''چلو، یہ بھی ٹھیک ہے۔'' بدا ینکار دوست نے تسلی دی۔

ہم ایک ایسی لفٹ میں پہنچے ہوے تھے جہاں تینوں کے پھنس کے کھڑے ہونے اور فرش پر سوٹ کیس رکھ دینے کے بعد اتنی جگہ بہرحال موجود تھی کہ زیرِ تربیت بُل فائٹر نے ہمارے ایئر بیگز ایک ایک کندھے پر ٹکا کے لفٹ کے کونے کی طرف چہرہ موڑ لیا تھا۔ اس طرح وہ میرے دوست کی گدی میں breathe کرنے کے بجائے لفٹ کے گوشے میں آزادی کا سانس لے سکتا تھا۔ ہشیار آدمی تھا۔

ہمارا کمرہ واقعی اچھا تھا۔ پیسوں کے حساب سے تو بہت ہی اچھا تھا۔

ریسپشنسٹ دوست نے ہمیں الماری میں نصب تجوری کے رموز سمجھانے کے لیے اس کے نمبروں والے تالے کو چلاتے پھراتے ہوے ایک خاصا ٹیکنیکل (چنانچہ مشکل) لیکچر شروع کر دیا۔ ہم نے کہا ناں ناں! تجوری وجوری چھوڑو، اپنے پاس ہے کیا جو اس میں رکھیں گے۔ اس نے لمحے بھر توقف کیا پھر ہم سے اتفاق کرتے اور tip کا شکریہ ادا کرتے ہوے اچھا وقت گزارنے کا مشورہ دیا اور روانہ ہو گیا۔

آدمی کبھی کتنی نادانی کر جاتا ہے۔ افسوس، ہم اگر غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرتے اور

تالے کے تکنیکی رموز کو اچھے ٹورسٹس کی طرح سمجھ لیتے تو وہ نہ ہوتا جو دوسرے دن ہوا اور جس کا علم ہمیں تیسرے دن ہو سکا۔

ہم دونوں دوست اپنے اپنے گھروں میں organized زندگی گزارتے ہوں گے (یا گزارنے پر مجبور ہوں گے) اپنے شیونگ کٹ اور ٹوتھ برش (اچھے انسانوں کی طرح) ہم واش روم میں سجا دیتے ہوں گے۔ استعمال کے بعد اپنے تولیے پھیلاتے اور غیر ضروری چیزیں سمیٹتے جاتے ہوں گے۔

یہاں ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ کم سے کم میں نے نہیں کیا۔

چنانچہ (بچوں کی ہدایات کے مطابق) میں نے کراچی سے، کسی کفایتی پیکیج ڈیل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، فلم کے جو پانچ rolls خریدے تھے، ان میں سے ایک رول اپنے کیمرے میں ڈال کر، کیمرے کو اپنی بیلٹ میں پہن کر بڑی امنگ، بہت شوق کے ساتھ میں اپنے ہدایتکار دوست سے چار قدم آگے چلتا ہوا ہوٹل سے نکل گیا۔ اور وہ جو عربی میں کہتے ہیں نا کہ ''زمین پر پھیل جاؤ'' تو دوست کے ساتھ مادرِ د شہر میں پھیل گیا۔

بے ڈھنگے پن کے کوئی تیئیس کہ چوبیس گھنٹے ہم نے گزارے۔ خوب گھومے پھرے۔ بہت سی جگہیں دیکھیں۔ طرح طرح کے فاسٹ فوڈ کھائے۔ کچھ ضروری فون کیے اور آتے جاتے ہوئے کمرے میں اپنے کپڑے، رومال، موزے اچھال اچھال کر غیر ذمہ دارانہ living کے سبھی ارمان پورے کر لیے اور پھر جو صفائی کرنے، کپڑے سمیٹنے بیٹھے تو معلوم ہوا وہ چار فلم رول جو کمرے میں کہیں ضرور موجود ہونے چاہیے تھے، اب نہیں ہیں۔

لاحول ولا...

میرا پہلا ری ایکشن تاسف کا تھا یعنی ہم نے کیوں نہ تجوری کے تالے کی تکنیک سمجھ لی، کیوں نہ اپنے رول تجوری میں رکھے، کیوں خود کو disorganized ہو جانے دیا۔ ہدایتکار دوست کا کہنا تھا کہ نہیں بڑے بھائی! ایسا بھی کیا ہے، ہم ایک مہذب ملک میں آئے ہیں۔ خود مہذب لوگ ہیں۔ ہم دوسروں پر اعتماد کر کے اپنے کمرے کو تالا لگا کر گئے تھے۔ جو چیز جہاں پڑی تھی وہیں پڑی ہونی چاہیے تھی، جو نہیں ہے۔ اب ایسا بھی کیا ہے۔

ریسپشنسٹ نوجوان نے ہدایتکار دوست سے پورا پورا اتفاق کیا کہ ہاں جی آپ مہذب لوگ ہیں۔ یہ ایک تہذیب یافتہ ملک ہے۔ آپ نے ہم پر بھروسا کیا ہے۔ جزاک اللہ... آپ اپنے کمرے کو تالا مار کر گئے تھے، very true لیکن... اہم م! آپ نے میرے عرض کرنے پر بھی ''تجوری کا علم'' نہیں سیکھا اور اس سہولت سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہم پوری پوری کوشش کریں گے کہ آپ کے گمشدہ فلم رول ''تلاش ہو جائیں''۔ لیکن آپ جانتے ہیں سرائے ہوٹل وغیرہ ایسے اسٹاف کے ذریعے چلتے ہیں جو شفٹوں میں آتا جاتا ہے۔ بے شک، ہمارا ریگولر اسٹاف سبحان اللہ! کیا دیانتدار لوگ ہیں! مگر ہم روزنداری پر بھی کارکن بھرتی کرتے ہیں۔ خاص طور پر صفائی والے۔ وہ بھی برے لوگ نہیں ہوتے لیکن سر! آپ کو تو پتا ہے Blah Blah Blah۔

ہدایتکار دوست بیٹھے سے اکھڑ گئے۔ کہنے لگے، میں آپ کے صفائی والوں سے ملنا چاہتا ہوں، ابھی۔ نوجوان نے عرض کیا کہ آپ کیا کریں گے مل کر؟ ہم خود ہی کچھ کرتے ہیں، آپ اطمینان رکھیں، گھومیں پھریں، اپنی وزٹ کیوں کڑوی کرتے ہیں۔ آپ کی فلمیں ''تلاش ہو جائیں گی''۔

بعد کو باہر جانے کی تیاری کرتے ہوئے ہدایتکار اپنی مزیدار آگرہ اسٹائل پنجابی میں کہنے لگے ''میں تے اِناں دے وٹ کڈ دیاں گا۔'' مطلب کس بل نکال دوں گا ان کے۔

شام میں ہم لوٹے تو ہوٹل کی مختصر لابی میں مراکشی نوجوان نظر آیا (اسے ہمارے دوست اب ''جینی رل فرانکو'' پکارنے لگے تھے)۔ وہ اداس سا دکھائی دیتا تھا۔ ہدایتکار دوست نے پوچھا، ''جینی رل فرانکو! کیا ہوا۔ منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟'' کہنے لگا کہ آپ لوگوں کے فلم رول گم ہو گئے، برا ہوا، میں اس بات سے اداس ہوں۔

وہ بولے، ''forget it، اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے، مل جائیں گے، نہیں ملے تو بھی کوئی مسئلہ نہیں۔''

فرانکو بولا کہ اصل میں رات ٹھیک سے میری پڑھائی نہیں ہو سکی، یہ الجھن بھی ہے۔ دوست نے تسلی دی کہ تم فکر مت کرو، ہم ہوٹل انتظامیہ سے ہرجانہ وصول کر لیں گے۔

مراکشی نے کہا، ''یہی تو پریشانی ہے۔ ہوٹل والے ہرجانہ نہیں دیتے۔''

دوست کہنے لگے" کیسے نہیں دیتے؟ ہہ ہا! ہم آگے تک جائیں گے۔"

"آپ آگے جائیں گے تو میں اور میرا دوست پیدرو اور آگے چلے جائیں گے یعنی ہوٹل سے باہر۔"

"کیا مطلب؟"

"ذرا پیچیدہ بات ہے، آپ نہیں سمجھو گے۔"

دوست کچھ برہم سے ہو کر بولے کہ میاں تم ہمیں گھامڑ کیوں سمجھتے ہو؟ سمجھاؤ گے تو کیوں نہیں سمجھیں گے؟

اگلے بیس منٹ میں جو کہانی unfold ہوئی وہ خاصی سنگین نوعیت کی اور گداز کر دینے والی تھی۔ بیس منٹ کی مدت اس لیے صرف ہوئی کہ یہ نوجوان مراکش کا تھا اور خاصا مہذب، self-respecting اور احسانمند بھی۔ اس نے بتایا کہ پیدرو اس کی کلاس میٹ لڑکی Nurie کا فیانسے ہے۔ سال بھر بعد نوری کا گریجویشن ہے۔ اس کے کوئی دو سال بعد پیدرو کو اکادمی سے "بل رنگز" کا بنیادی سرٹیفکیٹ ملے گا جس کے بعد وہ درجہ بدرجہ ترقی کرتا خود کو bull rings میں منواتا اس قابل ہو جائے گا کہ ایک اپارٹمنٹ لے سکے اور اتنی کمائی کر سکے کہ نوری اور وہ مادرِد میں رہتے ہوئے اپنا گھر چلا لیں۔ گویا ان کی شادی کو چار سے پانچ سال تک لگ سکتے ہیں۔ کوئی miracle ہو جائے تو یہ مدت گھٹ کے ساڑھے تین برس بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے کم نہیں۔

"اور sir! پیدرو کیتھولک بے شک ہے مگر جانتا ہے کہ miracles روز روز نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کو چار سے پانچ سال تک ایسے ہی رہنا پڑے گا۔ الگ الگ۔ اب ایک مشکل یہ بھی ہے کہ نوری کا گھر کاسابلانکا میں ہے۔ یہاں وہ اپنی ایک کزن کے ساتھ رہتی ہے no rent وغیرہ۔ بس وہ اپنے کھانے پینے کا، فیسوں کا خرچ اٹھاتی ہے۔"

"کہیں نوکری کرتی ہوگی نوری؟"

"ہاں جی، یہیں نوکری کرتی ہے، اسی ہوٹل میں۔"

"خوب!"

''جی ہاں، پارٹ ٹائم صفائی والوں میں ہے۔آپ کے film rolls جس روز گم ہوے، وہ ڈیوٹی پر تھی۔''

''او مائی گا...ا...ا...ڈ!'' دوست دھیرے سے بولے۔

''غلط نہ سمجھیں،نوری نے آپ کا کمرہ صاف نہیں کیا تھا۔She is a gem... A real lady۔''

''ہاں ہاں ہاں،I'm sure۔''

''آپ کا کمرہ اس لڑکی نے صاف کیا تھا جس کے گھر میں نوری رہتی ہے۔'' اور یہ کہہ کر مراکشی نوجوان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اپنے جوتے کی نوک سے دوسرے جوتے کا سول ٹھک ٹھک کر کے بجانے لگا۔

میں نے آہستہ سے کہا،''او مائی گاڈ!''

فرانکو مراکشی نے سر اٹھایا، کہنے لگا کہ نوری کی اس کزن کا پچھلا ریکارڈ کوئی زیادہ قابلِ رشک نہیں ہے۔صرف پیدرو کی مروّت کر کے management اسے رکھے ہوے ہے۔ پیدرو عزت دار آدمی ہے، دوست نواز۔نوبل اور شرمیلا۔ مجھے کہنا نہیں چاہیے Sir! this is utterly personal، مگر یہ سچی بات ہے کہ نوری اور وہ آج تک ساتھ نہیں سوئے۔سر! میں ادھر کی نہیں کہتا۔ادھر ایسا نہیں ہوتا But it looks significant to me... the Moroccan that I am.

''بیشک، بیشک۔'' ہم دونوں نے کہا۔

''سوری آپ کا ٹائم خراب کیا۔'' وہ اٹھ کے چلا، پھر بیٹھ گیا۔ جھک کے آہستہ سے کہنے لگا، ''آج رات تو آپ چیک آؤٹ نہیں کریں گے؟I hope''

ہم نے انکار میں سر ہلایا۔''کیوں کیا بات ہے؟'' ہدایتکار دوست نے پوچھا۔

''دو فلم رول شام کو آ جائیں گے اور دو پیدرو کل صبح لے آئے گا۔نو پرابلم۔''

ہم دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

پھر دونوں نے ایک ساتھ کہا،''ہرگز نہیں!''

''یہ بات اب ختم ہوگئی۔FINISH،اوکے؟No more discussion'' ہدایتکار نے ایک بار

جوش میں کہا، 'KHATAM' اور ہنسنے لگے۔

مراکشی بھی کھسیانی ہنسی ہنسا پھر سمجھانے لگا کہ ہم نوری سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایسا ایسا ہو گیا ہے۔ اسے بالکل نہیں بتا سکتے ورنہ وہ یہ job چھوڑ دے گی اور کزن کے ساتھ رہنا بھی چھوڑ دے گی اور اس کے اور پیدرو کے پرابلمز بڑھ جائیں گے۔

ہدایتکار آنکھیں نکال کر اور آواز دبا کے الٹی اسٹیج whisper میں دانت پیستے ہوئے بولے، کہ اے گھامڑ! ہم کہہ رہے ہیں نا کہ نو مور ڈسکشن۔ ہمارے کوئی فلم رول گم نہیں ہوئے۔ ہم سے فضول باتیں مت کرو بس — اور یارا جینی رل مراکشی! تم ہمیں رباط شہر کے بارے میں بتاؤ... یہ کہو کہ اس زمانے میں وہاں کا موسم کیسا ہوتا ہے۔

''آہا! رباط! Subhaan-Allah! وہ شہروں کا شہر! وہ مرحمت الٰہی'' اور اس نے ''یا قربان'' جیسے لحن میں کسی عربی قصیدے کی تان اٹھائی اور مزہ باندھ دیا۔

ہم اسے دیا گران کے ایک میکسیکن کیفے میں لے گئے اور coffee سے اس کی تواضع کی۔

اس طالب علم لڑکے سے، جو پڑھائی کا خرچ نکالنے کے لیے جھوٹ بول بول کے مسافروں کو اس سستے اور سکڑے سمٹے ہوٹل میں گھیر گھیر کے لاتا تھا، یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

دوسری بار ہم اس ہوٹل میں آئے تو صرف پیدرو ملا۔ بتانے لگا کہ فرانکو مراکشی اپنے امتحانوں کی تیاری میں لگا ہوا ہے۔

ہدایتکار دوست نے پوچھا، ''اور نوری؟''

اس کی آنکھیں گول ہو گئیں۔ ''آآئیں؟ You know Nurie?... you know her!?''

میں نے کہا، ''Of course, we know her. کیونکہ امفیاندا سے پیار کرتا ہے یار تم نو وس۔''

''آں؟! What do you mean by that?''

ہدایتکار نے انگریزی میں کہا، ''اس کا مطلب ہے نوری سے پیار کرتا ہے پیدرو۔''

پیدرو کی پوری بتیسی نظر آنے لگی۔ وہ ایک بار چابی کے گڈے کی طرح اُچھلا۔

پھر وہیں، ریسپشن کاؤنٹر کے باہر کھڑے کھڑے، اسپینی جوتا ڈانس کی گت میں، ہوٹل کے

چھوٹے سے مرمریں فرش پر ٹھکا ٹھک، ٹھکا ٹھک کر کے بل فائٹروں اور اصیل مرغوں کا ملا جلا ناچ ناچنے لگا۔

''اولے او لے!'' ہدایتکار دوست نے تال دینی شروع کر دی۔

بہار آمد بہار آمد بہار آمد

ہم اسپین میں تھے۔

اور اتنے بوڑھے ہرگز نہیں تھے جتنے نظر آتے تھے۔

برادرم! ایک رجحان ساز کتاب یاد آ گئی (ہوٹل کی بات سناتے ہوئے میں، مراکشی طالب علم کے اور افریقا کے بارے میں سوچتا تھا)۔

اس لیے... آ جاؤ افریقا!

سن 77/1976ء میں ایک امریکی مصنف Alex Haley نے اپنے ناول "Roots" کی اشاعت سے خاصا تہلکہ مچا دیا تھا۔ کتاب میں براعظم شمالی امریکا میں پکڑ کر لائے گئے افریقیوں کی بپتا بیان کی گئی تھی۔

اور ان کی اس ابتلا کی تاریخ ہزار تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھی گئی تھی۔

بڑے بڑے ثقہ لوگوں سے سنا جا رہا تھا کہ افریقی الاصل سیاہ فام لوگوں پر اتنا سچا اور ایسے معرکے کا ناول آج تک نہیں آیا۔

آوازہ پڑ گیا تھا کہ یارو! لپک لو۔ ''روٹس'' چھپ کر آ گئی ہے اور دھڑا دھڑ بک رہی ہے۔ کہیں ختم نہ ہو جائے۔

واقعی اس کتاب کی تیاری میں باون بکسوئے لگے تھے۔

کتاب دیکھتے ہی دیکھتے رجحان ساز بن گئی۔ ہزاروں صاحبِ حیثیت سیاہ فاموں نے (اور دوسروں نے بھی) اپنے اب وجد کا سراغ اٹھانے کے لیے، ان کے کوائف جاننے کے لیے ماہرین کی خدمات حاصل کر لیں۔

زرخرید غلاموں کے اور انھیں خریدنے والے 'مالکوں' کے خاندانی رکارڈ سے نکال نکال کر ان کے اصل کی چھان پھٹک اس طرح ہورہی تھی کہ کیا نسلی گھوڑوں اور کتوں کی pedigree چھانی جائے گی۔

بڑا پیسا خرچ ہورہا تھا۔ سچی بات تھی، مغرب میں پہلی بار ہما شما کے نسب کو وہ اہمیت حاصل ہو رہی تھی کہ جو طرّوں، دستاروں والوں (اور جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا) نسلی گھوڑوں کتوں کو بھی کبھی حاصل نہ ہوئی ہوگی۔

وکیلوں اور pedigree جاسوسوں کے دفاتر امریکا کے بڑے شہروں میں کھل گئے تھے۔ براعظم افریقا کے ان علاقوں میں کہ جہاں سے آدمی پکڑ پکڑ کر برآمد کے لیے "غلام منڈیوں" میں بھیجے جاتے تھے، ذیلی دفاتر کھول دیے گئے تھے جن میں ٹیلی فون لگا دیے گئے تھے، ٹائپسٹ بٹھا دیے گئے تھے۔

میں یہ کتاب اردو میں ترجمہ کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت تک اتنی ضخیم تصنیف ترجمے کی نیت سے نہیں اٹھائی تھی۔ بار بار کتاب کو اٹھایا اور (واقعی) بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیا، اس عزم کے ساتھ کہ ایک نہ ایک دن یہ کام کروں گا ضرور۔

مگر اب وقت گزر چکا، ایک عزیزہ نے یہ کام کر دکھایا۔ پچھلے دنوں اہلیہ کے ایک پڑھا کو شاگرد نے "مکالمہ" کے کسی شمارے کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ خوشخبری دی کہ ثمین مرزا صاحب نے "Roots" کا اردو ترجمہ چھاپ دیا ہے۔ بہت جی خوش ہوا۔ ترجمہ کار خاتون کے لیے اور برادرم! آپ کے لیے دل سے بہت دعائیں نکلیں۔ کس لیے کہ ایک اچھا، بلکہ بہت اچھا کام ہو گیا (اور خاں صاحب خود سے کیے گئے ایک وعدے سے بطریقِ احسن رہا ہوئے)۔

تالیف و تصنیف کی طرح ترجمہ ایک خیر کا کام ہے اور یہ ان خیر کے کاموں میں سے ہے کہ جو خاصے مشکل ہوتے ہیں۔ (تو کیا تصنیف سے ایک درجہ مشکل؟)

آپ جانتے ہیں، میں ترجمے کی ذمہ داری (بعض احباب کے کہے پر) اٹھاتا رہتا ہوں۔ خود سے اس رستے پر چل پڑنے کی ہمت کم ہی کرتا ہوں۔ وجہ عرض کر دی۔

اب تک جن شاہکار افسانوں کا ترجمہ کرتے ہوئے اور سال ہا سال بعد بھی بے انتہا خوشی محسوس کی ہے ان افسانوں کی تعداد (میرے حساب سے) انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔

پہلی بورخیس کی کہانی "The Handwriting of God" ہے جسے میں نے ''دستِ خداوند کی تحریر'' کے عنوان سے ترجمہ کیا اور جو میرے دوسرے مجموعے ''برجِ خموشاں'' میں شامل ہے۔ یہ کہانی ادبی جریدے ''آج'' میں چھاپی گئی ہے۔ یہ خوب پڑھی گئی اور بڑی داد و صول کی اس نے۔ یہ پڑھی جاتی رہے گی کیونکہ اسے، برادرم! خیال ہے کہ میرے ترجموں کے مجوزہ والیوم میں بھی شامل کیا جائے گا۔

دوسری کہانی حوان رلفو کی "Luvina" ہے یہ بھی ''آج'' میں چھپ چکی ہے۔ کسی کتاب میں نہیں آئی۔

ایک افسانہ برادرم آصف فرخی نے internet پر سے بڑے جتن سے اٹھایا تھا۔ اس کہانی کی بھی ایک کہانی ہے۔ میاں آصف سے سن کر کبھی اپنے پڑھنے والوں کو سناؤں گا۔ یہ معرکتہ لآرا کہانی ہے مارک ٹوئین کی "A War Prayer" جسے ''دُعائے جنگ'' کے عنوان سے میں نے اردو میں ڈھالا اور انھوں نے ''دنیازاد'' میں چھاپا اور اہلِ نظر سے داد و صول کی۔ یہ ترجمہ اب تک کسی کتاب میں نہیں آیا۔

برادرم مرزا صاحب! اس بار جی کرتا ہے کہ "Luvina" اور "A War Prayer" کے اپنے تراجم ''ٹکڑوں میں کہی گئی...'' پڑھنے والوں کی نذر کروں۔ رہ گئی بورخیس کی کہانی ''دستِ خداوند—'' تو جو نہ پڑھ پائے وہ اسے ترجموں کے موعودہ والیوم میں دیکھ لیں گے۔

تو لیجیے پہلے ''لووینا۔''

لووینا (تحریر: خُوان رلفو)

''جنوب کی پہاڑیوں میں لووینا کی پہاڑی سب سے زیادہ سنگلاخ اور اونچی ہے اور وہ اُن بھورے پتھروں سے اَٹی پڑی ہے جن سے چونا بنایا جاتا ہے۔ مگر لووینا میں اِن پتھروں سے کوئی چونا نہیں

بنا تا، نہ ہی انھیں کسی اور کام میں لاتا۔ وہاں اسے کچا پتھر کہا جاتا ہے، اور جو ٹیلا لووینا کی طرف چڑھتا چلا گیا ہے اُسے لوگ کچے پتھروں کی ٹیکری کہتے ہیں۔ سورج نے اور ہوا نے اُسے پرت پرت جھڑانے اور مٹانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہاں کی زمین ہمیشہ سفید رہتی ہے۔ ہر وقت ایسا لگتا ہے جیسے صبح کی شبنم میں چمک رہی ہو۔ مگر یہ کہنے کی حد تک ہے۔ کیونکہ لووینا میں دن بھی راتوں کی طرح سرد ہوتے ہیں اور شبنم زمین تک آتے آتے اوپر آسمان ہی میں گاڑھی ہو جاتی ہے۔

''اور یہاں کی ساری زمین کھڑی چٹانوں سے بنی ہے اور شگاف دار ہے۔ اس میں گہرے موکھے پڑ گئے ہیں جن کی تھاہ نظر نہیں آتی۔ لووینا والے کہتے ہیں کہ خواب انھیں موکھوں سے نکل کے آتے ہیں۔ میں نے تو بس ایک ہی چیز موکھوں سے آتی دیکھی ہے۔ وہ ہوا ہے جو ایسے سیٹیاں بجاتی نکلتی ہے جیسے اب تک نیچے گہرائی میں کہیں کسی نے اُسے نرکل کی نلیوں میں ٹھونس رکھا تھا۔ یہ ایسی ہوا ہے جو ذل گماراز کے ڈھیٹ پودوں تک کو نہیں جمنے دیتی۔ ورنہ یہ چھوٹے افسردہ پودے ایسے ہیں کہ تھوڑی سی بھی مٹی مل جائے تو اپنے سب پنجے پہاڑ کی کھڑی چٹان میں گڑائے جمے رہتے ہیں۔ انھیں یہاں ہوا نہیں نکنے دیتی۔ ہاں کبھی کبھار تھوڑی چھاؤں مل جائے تو چٹانوں میں دُبکے چکالوٹ کے پودوں میں پوست جیسے سفید پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ پر اس چکالوٹ کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے، یہ جلد ہی مرجھاتا اور سوکھ جاتا ہے۔ اس کی خاردار شاخیں ہوا کو جیسے کھرچنے لگتی ہیں۔ یہ کھرچنا تم سن سکتے ہو کیونکہ اس وقت ایسی آواز نکلتی ہے جیسے چاقو کو سان لگائی جا رہی ہو۔

''ہوا کو جو لووینا پر سے گزرتی ہے، تم دیکھ بھی لو گے۔ اتنی تاریک ہے وہ۔ لوگ کہتے ہیں وہ آتش فشاں کی ریت سے اَٹی رہتی ہے۔ جو بھی ہو، وہ کالی ہوا ہے۔ میں نے کہا نا، تم دیکھ ہی لو گے۔

''چیزوں کو وہ ایسے پکڑتی ہے جیسے بس انھیں دانتوں سے کاٹنے والی ہو۔ بہت دن تو ایسے ہوتے ہیں جب وہ مکانوں کی چھتوں کو یوں اُٹھا لیتی ہے گویا چھتیں نہیں ہیٹ ہیں اور اس نے انھیں اٹھا کے دیواروں کو برہنہ سر کر دیا ہے۔ اور پھر وہ کھرچنا شروع کرتی ہے۔ توبہ! توبہ! جیسے ناخن ہوں اس کے۔ صبح شام، گھنٹوں، بے رُکے دیواروں کو کھرچتے، مٹی کے کپڑ کے کپڑ اُکھاڑتے، دروازوں کے پٹوں جھریوں تلے اپنے تیز پھاوڑے چلاتے تم اسے سنتے رہو گے، سنتے رہو گے، یہاں تک کہ

لگے گا وہ تمھیں اندر سے متھ رہی ہے، رگڑ رہی ہے تمھیں، اور ہڈیوں تک کے جوڑ کھلے جا رہے ہیں۔ دیکھ لینا یہ سب۔''

آدمی جو بات کر رہا تھا تھوڑی دیر کو رکا... باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ انجیر کے درختوں کی شاخوں کے درمیان سے اپنا ریلا گزارتے، چڑھے ہوئے دریا کا شور ...اور بادام کے پتوں میں نرمی سے سرسراتی ہوا کی آواز...اور دُکان کی روشنی سے اُجل سی گئی اس تھوڑی جگہ میں کھیلتے ہوئے بچوں کا سب غل غپاڑا اُن دونوں تک پہنچ رہا تھا۔

پردار چیونٹیاں آئیں، وہ تیل سے جلنے والے لیمپ سے ٹکرا ٹکرا کر زمین پر گرنے لگیں ــــ اُن کے پر جھلس گئے تھے۔ باہر (معمول کے مطابق) رات گزرتی رہی۔

''ایے، کیمی لو! دو بیئر اور!'' آدمی نے پکار کے کہا، اِدھر اس سے کہنے لگا، ''ہاں مسٹر! ایک بات اَور ہے۔ لووینا میں نیلا آسمان تمھیں کہیں نہیں ملے گا۔ پورے چھجے پر میلی چکٹ چھاؤن چھائی رہتی ہے۔ ایک کالے دھبے کا بادل سا گھرا رہتا ہے جو کبھی نہیں ٹلتا۔ اور پہاڑیاں سب ننگی بوچی ہیں۔ کہیں ایک بھی درخت نہیں۔ کچھ بھی ہرا نہیں ہے کہ ذرا آنکھ ہی ستا لے، ہر شے راکھ جیسی دھند میں لپٹی رہتی ہے۔ ہاں۔ یہ تو تم دیکھ ہی لو گے کہ کیسا ہے سب کچھ۔ پہاڑیاں لاشوں کی طرح خاموش پڑی رہتی ہیں اور سب سے اونچی چوٹی پر بسا ہوا ہے، یہ...لووینا۔ اپنے سفید گھروں کے ساتھ جیسے مردوں کے سر کا تاج سا لگتا ہے۔ سالا!''

بچوں کا شور و غل پاس آ گیا، پھر دکان میں داخل ہو گیا۔ اِس پر آدمی کو اُٹھنا پڑا پھر دروازے تک جانا اور ان پر چیخنا پڑا، ''جاؤ رے جاؤ! کیوں ہمیں پریشان کر رہے ہو؟ کھیلتے ہو کھیلو، پر اتنا شور نہیں کرو۔'' پھر وہ واپس میز تک آیا، بیٹھ گیا اور بولا، ''ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ وہاں زیادہ بارش نہیں ہوتی۔ سال کے وسط میں کچھ طوفان جھپٹتے آتے ہیں۔ وہ زمین کی سنگلاخ پپڑی پر سے سب مٹی اکھاڑ لے جاتے ہیں، اور پر لڑھکتی چھوٹی بڑی چٹانوں پتھروں کے سوا کچھ نہیں چھوڑتے۔ اُس زمانے میں بادلوں کو بوجھل پن کے ساتھ اِدھر اُدھر ایک ٹیلے سے دوسرے تک اُچھل اُچھل کے جاتے ہوئے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بادل نہ ہوں بھرے ہوئے مشکیزے ہوں جو کھڑی

چٹان کے موکھوں کی دھار پر گرجتے، کڑکتے ٹکراتے ہوئے بس پھوٹنے ہی والے ہیں۔لیکن دس بارہ دنوں کے بعد وہ چلے جاتے ہیں اور پھر اگلے سال آتے ہیں۔کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ کئی کئی سال وہ ادھر کا رُخ نہیں کرتے۔ بتا تو رہا ہوں، زیادہ بارش وارش ہوتی نہیں ہے۔مشکل ہی سے کچھ ہوتی ہے۔اسی لیے زمین پرانے چمڑے جیسی سوکھی کھڑنک ہونے کے ساتھ ساتھ تڑخ جاتی ہے اور گٹی کی طرح کے سخت نوکیلے ڈھیلوں سے پورم پور بھر جاتی ہے۔اور جب تم اس پہ چلتے ہو تو مٹی کے یہ ڈھیلے پاؤں میں گڑتے ہیں۔لگتا ہے خود زمین نے کانٹے نکال لیے ہیں۔تو یہ قصہ ہے یہاں۔''

ایک ہی بار میں وہ اپنی بیئر چڑھا گیا۔ بوتل میں بس جھاگ کے بلبلے رہ گئے تو وہ شروع ہوگیا، ''جہاں سے بھی دیکھو، بڑی اُداسی جیسی بیٹھی ہوئی ہے۔مسکرانا وہاں کوئی جانتا ہی نہیں۔لوگوں کی شکلیں جیسے فریز ہوگئی ہیں۔(فریز سمجھتے ہو؟) جی چاہے جب دیکھ لو—جمی ہوئی ہے یہ اداسی، ٹلتی ہی نہیں صورتوں سے۔ہوا کے جھونکے اسے اِدھر اُدھر چلاتے رہتے ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اسے اُڑا کے لے جائیں۔لگتا ہے وہیں پیدا ہوئی ہے اور وہیں رہے گی اور ایسا ہے کہ تم اس کا احساس جیسا برابر کر سکتے ہو، اپنی زبان پر اس کا مزہ محسوس کر سکتے ہو، کیونکہ وہ ہمیشہ تمھارے اوپر، بالکل تمھارے ساتھ لگی رہتی ہے۔اور اس لیے بھی کہ یہ بہت بھاری ہوتی ہے، پلاسٹر کے بڑے تودے جیسی، دل کے زندہ گوشت پر اپنا بوجھ ڈالے ہوئے... یہ اُداسی۔

''وہاں کے لوگ کہتے ہیں، جب پورا چاند ہوتا ہے تو وہ لووینا کی سڑکوں پر ہوا کو جھاڑو دیتے دیکھ سکتے ہیں—کہتے ہیں اس نے—ہوا نے—اپنی پشت پر ایک کالا کمبل سا پھیلایا ہوتا ہے لیکن پورے چاند میں، میں جتنا کچھ لووینا میں دیکھ پایا ہوں، میرے لیے تو وہ ہمیشہ مایوسی کی ایک تصویر ہی ہوتی تھی... ہمیشہ۔

''مگر، بھائی! اپنی بیئر تو پی ڈالو۔ میں دیکھ رہا ہوں تم نے اُسے چھوا تک نہیں ہے۔ پیو، پیو۔ گرم شاید تمھیں اچھی نہیں لگتی۔ یہاں تو ایسی ہی ملتی ہے۔ مجھے پتا ہے تمھیں بری لگے گی، گدھے کے پیشاب جیسی۔لیکن یہاں اس کی عادت سی پڑ جاتی ہے۔قسم سے کہتا ہوں، وہاں یہ بھی نہیں ملے گی۔ جب وہاں پہنچو گے تو یہ سب یاد آئے گی۔

''پینے کو وہاں ایک ہی قسم کی دارو ملتی ہے جسے وہ ہویازے نام کے کسی پودے سے بناتے ہیں۔ پہلے ہی گھونٹ کے بعد تمھارا سر ایسا گھومے گا کہ چکرگھنی ہو جائے گا۔ لگے گا تم نے اسے کسی چیز سے ٹکرا دیا ہے۔ اس لیے اچھا ہی ہوگا جو یہ بیئر پی لو گے۔ مجھے پتا ہے میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

باہر سے اب بھی دریا کے جوجھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی — ہوا کا شور، بچوں کے کھیلنے کی آواز — شام کا وقت ابھی شروع ہوا تھا۔

وہ آدمی ایک بار اور دروازے تک گیا، پھر وہاں سے کہتا ہوا آیا: ''بھیا! ابھی اِس جگہ بیٹھ کے، جہاں، اُس جگہ جیسا کچھ بھی نہیں ہے، چیزوں کو اپنی یادداشت سے نکال نکال کے لانا اور دیکھنا کوئی آسان کام ہے؟ لیکن جب بات ہولووینا کی تو جو کچھ مجھے معلوم ہے اس کے بارے میں بولنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ میں وہاں رہا ہوں نا۔ وہاں اپنی بیتی زندگی چھوڑ کے آیا ہوں۔ اُس جگہ سپنوں سے بھرا ہوا پہنچا تھا اور بوڑھا اور تھکا ہوا لوٹا ہوں اور اب تم وہاں جارہے ہو۔ ٹھیک ہے۔ لگ رہا ہے شروع شروع کا قصہ مجھے سب یاد آرہا ہے۔ دیکھو تمھاری جگہ خود کو رکھ کے سوچتا ہوں — ہاں، میں پہلے پہل لووینا پہنچا تو — لیکن تم اپنی بیئر سے پہلے مجھے ایک گھونٹ لینے دو گے؟ ہہا۔ تمھیں اس کی پرواہی نہیں ہے۔ پر میرے یہ بہت کام آئے گی۔ بڑا سکون دیتی ہے۔ ایسا کر دیتی ہے مجھے جیسے سمجھو روغنِ کافور سے سر کی مالش ہوئی ہو۔ تو میں کہہ رہا تھا، جب پہلی بار میں لووینا پہنچا تو اس خچر والے نے، جو ہمیں لے کے گیا تھا، اپنے جانوروں کو ستانے بھی نہیں دیا۔ ہمیں اُتارتے ہی وہ آدھا گھوم گیا، بولا 'میں واپس جارہا ہوں۔'

''ٹھیرو۔ جانوروں کو دَم بھی نہیں لینے دو گے؟ بہت تھک گئے ہیں۔

''بولا، یہاں ان کی حالت اور بھی خراب ہو جائے گی۔ ہاں، نکل ہی جاؤں تو اچھا ہے۔

''اور وہ بھاگ لیا، کچے پتھروں والی ٹیکری سے ڈپٹتا ہوا، اپنے جانوروں کو ایڑ لگاتا، بھاگم بھاگ، جیسے وہ کوئی جگہ نہ ہو شیطان کا ٹھکانا ہو۔

''میں، میری بیوی، تینوں بچے وہاں بیچ چوراہے میں رُکے کھڑے رہے، اپنا سامان اُٹھائے۔ ایسی جگہ کے بالکل بیچوں بیچ جہاں آپ بس ہوا چلنے کی آواز سن سکتے تھے...

''بس یہ ایک چوک تھا، جہاں ہوا روکنے کو ایک پودا بھی نہیں تھا، وہاں تھے ہم۔

''میں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ اگر۔یا ئنا! ہم کہاں آ گئے۔ یہ کیا جگہ ہے؟

''اور جواب میں اس نے کندھے اُچکا دیے۔

''میں نے کہا کہ اچھا، ایسا ہی ہے تو تم جا کے کوئی جگہ دیکھ آؤ جہاں کچھ کھا پی لیں گے، رات گزار لیں گے۔ جاؤ، ہم یہاں تمھارا انتظار کر لیتے ہیں۔

''اُس نے سب سے چھوٹے بچے کا ہاتھ پکڑا، اسے لے کے چلی گئی۔ اور پھر واپس نہیں آئی۔

''جھٹپٹا ہونے لگا، جب سورج کی روشنی اتنی رہ گئی کہ اس میں صرف پہاڑیوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں تو ہم اسے ڈھونڈنے نکلے اور لووینا کی چھوٹی پتلی سڑکوں پہ کچھ دیر چلتے رہے، آخر وہ ہمیں سنسان گرجا گھر میں بیٹھی ہوئی ملی، بچہ اس کی ٹانگوں کے درمیان سویا پڑا تھا۔

''اگر۔یا ئنا! یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟

''کہنے لگی کہ دُعا کرنے آئی ہوں۔

''میں نے پوچھا، کیوں؟

''اس نے اپنے کندھے اُچکا دیے۔

''وہاں کون تھا جس سے دُعا کی جاتی؟ ایک خالی ڈھنڈار جھونپڑا تھا جس میں دروازے تک نہیں تھے۔ کچھ کھلی سی گیلریاں تھیں اور ایک دراڑوں، سوراخوں والی چھت جس میں سے ہوا ایسے چلی آ رہی تھی جیسے چھلنی میں سے آتی ہے۔

''چائے خانہ، ہوٹل وٹل کہاں ہے؟

''بولی، یہاں کوئی چائے خانہ، ہوٹل نہیں ہے۔

''کوئی سرائے؟

''کہنے لگی یہاں کوئی سرائے نہیں ہے۔

''میں نے پوچھا کہ تمھیں کوئی نظر آیا؟ کوئی رہتا بھی ہے یہاں؟

''بولی... ہاں، سامنے سڑک پار کر کے عورتیں ہیں کچھ — اب بھی نظر آ رہی ہیں مجھے۔ وہ

دیکھو، دروازوں کی جھریوں میں سے اُن کی آنکھیں چمکتی نظر آتی ہیں۔ برابر ہمیں گھورے جا رہی ہیں۔ دیکھو— مجھے اُن کی آنکھوں کی چمکتی پتلیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ لیکن ہمیں کھانے کو دینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ دروازوں سے سر نکالے بغیر وہ مجھے بتا رہی تھیں کہ پورے قصبے میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ تو پھر میں— دعا کرنے خدا سے مدد مانگنے— یہاں آ گئی۔ یہ کہہ کے وہ چپ ہو گئی۔

''واپس چوک میں کیوں نہیں گئیں؟ ہم تمھارا انتظار کر رہے تھے۔

''بولی، یہاں دعا کرنے آئی تھی۔ ابھی دعا ختم نہیں ہوئی۔

''یہ کیسی جگہ ہے، اگر یپائنا؟

''اور اس نے پھر اپنے کندھے اُچکا دیے۔ک

''ہم نے وہیں گرجا گھر کے ایک کونے میں، گرائی ہوئی قربان گاہ کے پیچھے رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ جھکڑ وہاں بھی پہنچ رہے تھے، لیکن اتنے فراٹے دار نہیں تھے۔ ہم اُنھیں آتے، دُہرے دروازوں کے غار نما خلا سے ہو کر نکلتے اور ہم پر سے لمبی چیخیں مارتے، بین کرتے گزرتے ہوئے سنتے رہے۔ ہم اُنھیں ہاتھوں میں ہوا کے تھپیڑے اٹھائے نشان گاہوں پر نصب صلیبوں پر کوڑے برساتے سنتے رہے۔ مسکیت لکڑی کی کھپچیوں سے بنے کتنے ہی کھردرے صلیب نشان گرجا گھر کے طول میں تاروں سے کسے دیواروں سے لٹک رہے تھے، جھکڑوں کے ہر تھپیڑے پر جب یہ تارتن تناتن جیسی آواز میں بجتے تو ایسا لگتا جیسے کوئی دانت پیس رہا ہو۔

''بچے رونے لگے، اس لیے کہ بہت ڈرے ہوئے تھے، سو نہیں سکتے تھے۔ میری بیوی سب کو بانہوں میں سمیٹنے کی کوشش میں تھی۔ وہ نکلے پڑتے تھے اور ماں اُنھیں کولی میں بھرنے کا جتن کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔

''صبح ہونے سے کچھ پہلے ہوا دھیمی ہو گئی۔ پھر واپس اسی طرح چلنے لگی مگر صبح میں ایک وقت ایسا ضرور آیا جب سب چیزیں رُک گئیں، یوں لگا جیسے آسمان زمین سے آ ملا ہے اور اس نے اپنے بوجھ سے سارا شور کچل کے رکھ دیا ہے۔ بچوں کو سکون سے سانس لیتے سنا جا سکتا تھا۔ وہ اب آرام سے تھے۔ مجھے قریب سے اپنی بیوی کا بھاری سانس سنائی دیا۔

''پُو چھنے لگی، یہ کیا ہے؟

''کہاں کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

''یہ؟—آواز؟

''یہ سناٹا ہے—جاؤ سو جاؤ۔ کچھ آرام ہی کر لو۔ تھوڑی دیر میں دن نکل آئے گا۔

''مگر جلد ہی وہ آواز میں نے بھی سن لی۔ ایسی آواز تھی جیسے چمگادڑیں اندھیرے میں پھڑپھڑاتی ہوئی ہمارے پاس سے گزری ہوں۔ بڑے پروں والی چمگادڑیں، جن کے پر زمین کو چھوتے ہوئے جا رہے ہوں۔ میں اٹھا تو پروں کی پھڑپھڑاہٹ تیز ہو گئی۔ جیسے چمگادڑوں کا وہ جھنڈ بھڑک گیا ہو اور دروازوں کے سوراخوں کی طرف اُڑنے لگا ہو۔ اپنے آگے آگے ہلکی سرسراہٹ محسوس کرتا، میں پنجوں کے بل وہاں تک پہنچا، دروازے پر رُکا—اور تب میں نے انھیں دیکھا۔ میں نے پانی کے قرابے کندھوں پر اُٹھائے لووینا کی سب عورتوں کو دیکھا۔ چادریں سروں پر ڈالے ہوئے، میں نے اُن کے سیاہ وجود رات کے تاریک پس منظر میں دیکھے۔

''میں نے پوچھا، 'کیا چاہیے؟ رات میں اس وقت تم لوگ کیا ڈھونڈ رہی ہو؟'

''ان میں سے ایک بولی، 'ہم پانی لینے جا رہے ہیں۔'

''میں نے انھیں سامنے کھڑے دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں اور پھر جیسے کہ وہ سائے ہوں، اپنے سیاہ قرابے اٹھائے وہ سڑک پر چل پڑیں۔

''نہیں بھئی۔ وہ پہلی رات میں کبھی نہیں بھولوں گا جو میں نے لووینا میں گزاری۔

''کیا خیال ہے تمھارا؟ ان یادوں کا کڑواپن دور کرنے کو ہی سہی—اور بیئر منگانا کیا ضروری نہیں ہو گیا؟

''ایسا یاد آ رہا ہے جیسے تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کتنے برس لووینا میں رہا ہوں— ہیں نا؟ سچی بات یہ ہے، مجھے خود نہیں معلوم۔ وقت کو سمجھنے کی جو لیاقت ہوتی ہے نا— جب سے بخار نے مجھے پکڑا ہے تو وہ لیاقت اس نے میرے لیے گڈمڈ کر چھوڑی ہے۔ ہہا۔ میں سمجھتا ہوں اب تو ہمیشوں ہمیش سے ہی لووینا میں ہوں۔ وقت بڑا لمبا ہوتا ہے وہاں۔ وہاں کوئی گھنٹوں کو نہیں گنتا اور کسی کو فکر نہیں

ہوتی کہ برسوں پر برس کیسے اکٹھا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دن شروع ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ پھر رات آتی ہے۔ بس دن اور رات... یہاں تک کہ موت آ جاتی ہے، جوان کے لیے ایک امید ہے۔

''تم سوچتے ہو گے میں ایک ہی راگ الاپے جا رہا ہوں۔ ہاں بھائی! صحیح ہے۔ ایک ہی راگ الاپ رہا ہوں۔ دروازے کی چوکھٹ پہ بیٹھ کے سورج کو نکلتے ڈوبتے دیکھنا، اپنا سر اٹھاتے جھکاتے ہوئے، یہاں تک کہ کمانیاں ڈھیلی پڑ جائیں۔ پھر ہر چیز رک جائے، وقت کی گرفت سے نکل جائے ہر چیز۔ اور پھر یوں لگتا ہے جیسے آدمی اس ہمیشوں ہمیش ہی میں رہتا رہا ہے۔ تو یہ حال ہے وہاں کے بوڑھے لوگوں کا۔

''کیونکہ — بقول ان کے — جو واقعی بوڑھے ہیں اور جو ابھی پیدا نہیں ہوئے، لووینا میں بس وہی رہتے ہیں۔ اور ہاں، کمزور عورتیں بھی، اتنی دبلی کہ سمجھو ہڈی اور چمڑا۔ جو بچے وہاں پیدا ہوئے تھے وہ تو سب چلے گئے۔ دن کی روشنی بھی مشکل ہی سے دیکھ پاتے ہیں کہ وہ بڑے ہو جاتے ہیں۔ وہاں یہ کہاوت کہی جاتی ہے کہ بچے اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے چھلانگ مارتے ہیں تو پھر پھاوڑا سنبھال لیتے ہیں اور لووینا سے غائب ہو جاتے ہیں۔ تو اس طرح ہے لووینا میں۔

''وہاں صرف بڈھے رہ گئے ہیں اور اکیلی عورتیں، یا ایسی جن کے شوہر ہیں مگر پتا نہیں کہاں گئے ہوئے ہیں۔ جن طوفانوں کا میں بتا رہا تھا، وہ آتے ہیں تو یہ شوہر لوگ بھی برابر چلے آتے ہیں۔ وہ قصبے میں آتے ہیں تو ہر طرف ایک سرسراہٹ سنائی دیتی ہے اور دوبارہ جب چلے جاتے ہیں تو بس شکوے یا بڑبڑاہٹ جیسی آواز رہ جاتی ہے۔ وہ لوگ بڈھوں کے لیے کھانے پینے کا تھیلا بھر سامان چھوڑتے اور اپنی عورتوں کے شکم میں ایک اور بچے کا بیج ڈال جاتے ہیں۔ ایک اور برس گزر جاتا ہے اور ان کے بارے میں اور کوئی خبر نہیں ملتی۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کبھی ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہو پاتا۔ یہی دستور ہے۔ وہاں سب سمجھتے ہیں کہ قانون اسی طرح ہے، لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔ بچے ماں باپ کے لیے کام کر کر کے اپنی عمر ختم کر دیتے ہیں، جس طرح ان کے ماں باپ نے اپنے ماں باپ کے لیے عمریں ختم کی تھیں اور پیچھے خدا جانے کتنی نسلوں نے اسی طرح اپنی ذمہ داری پوری کی ہوگی؟

''اس دوران میں بڈھے لوگ دروازوں کی چوکھٹوں پر بیٹھے اُن کا... اور موت کا انتظار کرتے

رہتے ہیں۔ بازو ان کے ڈھیلے پن سے لٹکے ہوتے ہیں۔ صرف بچوں کی احسان مندی اُن میں کوئی تحریک پیدا کرے تو کرے، ورنہ وہ بڈھے بالکل تنہا ہوتے ہیں— اس اجاڑ قصبے لوو ینا میں۔''

''ایک روز میں نے انھیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ سب کسی دوسری جگہ چلیں جہاں زمین اچھی ہے۔ 'چلو یہاں سے۔' میں نے ان سے کہا، 'چلو۔ کسی نہ کسی طرح ہم کہیں جمنے کا بندوبست کر لیں گے۔ حکومت ہماری مدد کرے گی۔

''وہ سنتے رہے اور پلکیں جھپکائے بغیر اپنی آنکھوں کی گہرائی میں سے، جہاں سے بہت تھوڑی روشنی آ رہی تھی، مجھے گھورتے رہے۔

''ایک بولا، 'ٹیچر! تم کہتے ہو حکومت ہماری مدد کرے گی؟ تم حکومت کو جانتے ہو؟'

''میں نے کہا کہ 'ہاں جانتا ہوں۔'

''ہہہ! اتفاق سے ہم بھی اُسے جانتے ہیں لیکن ہم حکومت کی ماں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

''میں نے بتایا کہ بھئی یہ تمھارا ملک ہے۔ انھوں نے انکار میں سر ہلایا کہ نہیں۔ اور وہ ہنسے۔ یہ پہلا موقع تھا جو میں نے لوو ینا کے لوگوں کو ہنستے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے پوپلے منھ کھول کے مسکرائے اور بولے کہ نہیں حکومت کی کوئی ماں نہیں ہے۔

''اور بھائی، تمھیں پتا ہے؟ وہ صحیح کہہ رہے تھے۔ ان کا مالک انھیں صرف اس وقت یاد کرتا ہے جب ان 'لڑکوں' میں سے کوئی وہاں کچھ غلط سلط کر بیٹھتا ہے۔ تب اس کے لیے وہ کسی کو لوو ینا میں بھیجتے ہیں اور وہ آ کے اسے مار دیتا ہے۔ اس کے سوا ان مالکوں کو پتا نہیں ہے کہ لوگوں کا یہاں کوئی وجود بھی ہے— ایسی جگہ ہے یہ— لوو ینا۔ اب تم جا ہی رہے ہو، تو خود ہی پتا چل جائے گا۔ میں تو کہتا ہوں، یہ وہ جگہ ہے جہاں اداسی سالی گھونسلا بنا کے بیٹھی ہوئی ہے۔

''وہ کہنے لگے کہ تم ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو کہ ہمیں لوو ینا چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ تمھارے خیال میں ہم بلا وجہ بہت بھوکوں مر لیے۔ بتاؤ؟ اگر ہم یہاں سے نکلے تو ہمارے مُردے کون ساتھ لے کے چلے گا؟ وہ بھی یہیں ہیں۔ ہم انھیں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے۔

''تو بس وہ ابھی بھی وہیں پڑے ہیں۔ اب تم جا ہی رہے ہو، دیکھ لو گے انھیں۔ بھوک بھگانے کو

بسکیت لکڑی کا گودا چباتے اور پیک نگلتے ہوئے۔تم انھیں سایوں کی طرح گزرتے، گھروں کی دیواروں سے چپکے، سرکتے ہوئے — دیکھ ہی لوگے۔ ہوا تقریباً انھیں کھینچتی لیے جاتی ہے۔

''میں نے آخران سے کہا کہ 'سنو! تم اس ہوا کی آواز نہیں سن رہے؟ یہ تمھیں ختم کر دے گی۔'

''وہ کہنے لگے، جب تک اسے چلنا ہے چلے گی۔ یہ امرالٰہی ہے۔ مرضی ہے اُس کی۔ ویسے اس کا رک جانا اچھا نہیں ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو سورج لووینا میں اتر آتا ہے اور جو بھی کچھ تھوڑی بہت نمی ہماری کھال کے نیچے ہوتی ہے اُسے اور ہمارے لہو کو چوس لیتا ہے۔ ہوا سورج کو اوپر ہی رکھتی ہے، نیچے نہیں آنے دیتی۔ اسی طرح صحیح ہے۔

''تو بس، میں نے ان سے اور کچھ نہیں کہا۔ لووینا چھوڑ دیا میں نے۔ واپس نہیں گیا، نہ کبھی جانے کا ارادہ ہے۔

''لیکن دیکھو دنیا کس طرح گردش کرتی رہتی ہے۔ اب کچھ ہی گھنٹوں میں تم وہاں جا رہے ہو۔ کوئی پندرہ برس ہوتے ہیں جو انھوں نے یہی بات مجھ سے کہی تھی، 'تم سان یوآن لووینا جا رہے ہو۔'

''ان دنوں جان تھی مجھ میں۔ سوچوں، خیالوں سے سمجھو بھرا ہوا تھا۔ تمھیں تو معلوم ہے آدمی کبھی کیسا پورم پور ہوتا ہے۔ منصوبوں وغیرہ سے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے انھی سے کچھ نہ کچھ بنا لینے کے خیال کے ساتھ جاتا ہے۔ مگر لووینا میں یہ سب نہیں چل سکا۔ کر کے دیکھ لیا میں نے۔ نہیں چل سکا۔

''سان یوآن لووینا۔ یہ نام مجھے ایسا سنائی دیا تھا جیسے کسی بہشت کا نام ہو۔ مگر وہ اعراف ہے، کسی کفارے کا مقام۔ مرتی ہوئی جگہ ہے وہ۔

''ایسی کہ وہاں کتے بھی مر مرا کے ختم ہو گئے ہیں۔ اب وہاں سناٹے پر بھونکنے والی کوئی مخلوق نہیں ہے، کیونکہ جوں ہی کوئی وہاں چلنے والی ہوا کا عادی ہو جاتا ہے، وہ بس اُن خدائی خوار اُجاڑ جگہوں میں راج کرتے سناٹے ہی کو سنتا ہے اور اسی سے آدمی ڈھے جاتا ہے۔ مجھے دیکھو، مجھے کیا کر دیا اس نے۔ اب جا ہی رہے ہو، جلدی سمجھ جاؤ گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

''تم کیا کہتے ہو؟ اس بھائی کو گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی مسکال ڈالنے کو کہیں؟ بیئر کے ساتھ یہ چکر ہے کہ ذرا ذرا دیر بعد اُٹھ کے باہر جانا پڑتا ہے، اس سے اپنی باتوں میں کافی خلل پڑتا ہے۔

اے! کیمی لو! اس دفعہ اپنے لیے دو مسکال لے کے آ۔"

"ہاں۔ میں تم سے کہہ رہا تھا کہ...!"

مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ میز پر اسی جگہ ایک ٹک دیکھا کیا جہاں بے پروالی پردار چیونٹیاں اب ننگے کیڑوں کی طرح چکراتی پھر رہی تھیں۔

باہر رات کو آگے بڑھتے سنا جا سکتا تھا۔ انجیر کے تنوں سے پانی کے ٹکرانے کی لپ لپ آواز آ رہی تھی۔ بچوں کا شور وغل، اب بہت دور سے آ تا تھا۔ دروازے کے چھوٹے سوراخ سے ستارے جھانک رہے تھے۔

آدمی جو پردار چیونٹیوں کو تکے جا رہا تھا وہ اب میز پر ایک طرف لڑھک گیا تھا، اور سو گیا تھا۔

❦❦❦

دعائے جنگ (تحریر: مارک ٹوئین)

زبردست جوش و خروش کے دن تھے، ملک، ہتھیار بند ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جنگ جاری تھی۔ لگتا تھا ہر دل میں حبِ وطن کی آگ روشن ہے۔ اِدھر نقارے پر چوب پڑتی تھی اُدھر بینڈ بج رہے تھے۔ کہیں کھلونا پستول پھٹ پھٹ کرتے اور پٹاخے سلگتے چٹختے تھے۔ ہر ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ دور تک جاتی چھتوں چوباروں کی دھندلی پڑتی بچھات پر لہراتے پرچموں کا ایک دشتِ بے نہایت دھوپ میں پڑا الشکتا تھا۔

بھڑک دار نئی نفیس وردیوں میں نوجوان رضا کاروں کے جیش چوڑی شاہراہ سے قوائد پریڈ کرتے روز گزرتے تھے۔ یہ ٹکڑیاں جھولتی لہراتی برابر سے نکلتیں تو ان پر ناز کرتے ماں باپ بہنیں اور محبوبائیں فرطِ جذبات سے پھنسی ہوئی اور مسرت سے چھلکتی آوازوں میں تحسین کے نعرے سر کرتے تھے۔ راتوں کو عام جلسوں میں، جہاں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی، لوگوں کے ہانپتے ہوئے ہجوم حبِ وطن میں ڈوبی خطابت سنتے۔ یہ خطابت دلوں کو ہلا کے رکھ دیتی اور گہرائیوں میں اترتی تو سب کچھ اتھل پتھل کر دیتی۔ پھر اگر ایک لمحے کا وقفہ بھی آتا تو لوگ اسے تابڑ توڑ تالیوں سے بھرتے جاتے۔ اس دوران میں آنسو ان کے رخساروں پر لکیریں بنا کے بہتے رہتے۔

گرجا گھروں میں خطیب اور پادری صاحبان اپنی خطابت سے اس قیامت کا طوفان اٹھا

رہے تھے کہ رہے نام مالک کا۔ وہ ملک اور پرچم سے وفاداری کی تلقین کرتے، خدائے حرب و جدال کی دُہائی دیتے اور اس سے التجا کرتے کہ اس عظیم مقصد میں وہ ان کی مدد فرمائے۔

بے شک یہ دور مسرتوں کا اور خداوند کی عنایتوں اور بخششوں کا دور تھا۔ تاہم چار چھ ناعاقبت اندیش افراد نے جنگ کو ناپسند کیا اور اس نیک و صالح صراطِ مستقیم پر شک سا ظاہر کرنے لگے۔ ان کو ایسی غضبناک وارننگ دی گئی کہ دوبارہ یہ سب کرنے اور لوگوں کی خفگی مول لینے کی اُن کی پھر ہمت نہ ہوئی۔

اتوار کی صبح ہوئی۔ اگلے روز فوجی دستوں کو محاذ پر جانا تھا، گرجا گھر میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، سبھی رضا کار موجود تھے، اُن کے چہرے حقیقت کے رنگوں میں رنگے ہوئے خوابوں سے روشن تھے جن میں سخت پیش قدمی اور رفتار پکڑتی، لپکتی یلغار اور لشکتی شمشیروں کی تصویریں تھیں اور شور و غوغا کے اور غنیم کی پسپائیوں، گھیرتے ہوئے دھویں اور غضبناک تعاقب سے لے کر ہتھیار ڈالنے تک کے زندہ مناظر تھے! ان خوابوں میں میدانِ جنگ سے گھر لوٹتے دلاوروں کے سنولائے ہوئے چہرے تھے کہ جن کے سواگت میں خوب جے جے کار ہوئی تھی، جنھیں خوب سراہا گیا تھا، جنھیں عظمت و اقبال مندی کے سنہرے سیلاب میں گلے گلے ڈبو دیا گیا تھا۔

رضا کاروں کے ساتھ ان کے عزیز پیارے بیٹھے تھے... بہت مغرور و شاداں۔ اُن کی قسمت پر وہ ہمسائے اور دوست رشک کرتے تھے جنھیں عزت کی رزم گاہ میں بھیجنے کے لیے وہ بیٹے اور بھائی نصیب نہیں تھے جو یا تو پرچم کے لیے فتح یاب ہو کر لوٹتے یا انتہائی بلند رتبہ موت سے سرفراز ہوتے۔

عبادت کا آغاز ہوا، عہد نامۂ عتیق سے جنگ کے ایک باب کی تلاوت کی گئی۔ دُعائے اوّل پڑھی گئی، جس کے بعد ارگن باجے کے سُر اِس شدت سے پھوٹے کہ گرجے کی عمارت لرزنے لگی۔ حاضرین ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دھڑکتے دلوں اور چمکتی آنکھوں سے انھوں نے خدائے منتقم کی دُہائی دی، اُس کی زبردست جبروت کی ثنا اور استمداد اِس طور سے کی کہ اے صاحبِ جلال، اے قہار! بجلی کا کڑکا تیری نفیری، اُس کا لشکارا تیری تلوار ہے! سو ہمیشہ تیرا ہی امر نافذ رہے۔

اس کے بعد ''دعائے طویل'' شروع ہوئی۔ کسی کو یاد نہیں کہ اتنی گرم و پُرجوش استدعا اتنے رقت انگیز اسلوب میں پہلے کبھی کی گئی ہو۔ اس التجا میں ٹیپ کا بند یہ تھا کہ ہمیشہ کرم کرنے والا ہمارا

ارحم الراحمین باپ ہمارے عالی رُتبہ نوجوان سپاہیوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے، ان پر اپنی برکتیں نازل فرمائے اور حب الوطن کے اس فرض کی ادائی میں ان کی اعانت کرے، ہمت دے، ان کا حوصلہ بڑھائے، انھیں اپنے دستِ زورآور کی پناہ میں لے لے۔ اس خوں ریز پیکار میں انھیں مضبوط، ثابت قدم اور ناقابلِ تسخیر رکھے، غنیم کو کچلنے میں ہر طرح ان کی مدد فرمائے۔ انھیں، ان کے پرچم اور ملک کو لازوال سربلندی اور شکوہ عطا کرے۔

اسی وقت ایک عمر رسیدہ اجنبی گرجا میں داخل ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے نشستوں کے درمیانی رستے پر بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں پادری پر لگی ہوئی تھیں، اس کا لانبا قد پیروں تک آتے لبادے سے ڈھکا تھا۔ سر کھلا تھا اور سفید بال جھاگ اڑاتے چشمے کی طرح شانوں تک آ رہے تھے، جھریوں بھرا چہرہ غیر فطری زردی لیے ہوئے تھا، یوں لگتا تھا جیسے مردنی چھائی ہو۔ سب آنکھیں جاننے کے اشتیاق میں اس پر لگی تھیں۔ وہ خاموشی سے چلتا رہا، بے رکے سیڑھیاں چڑھ کر پادری کے برابر جا کھڑا ہوا اور انتظار کرنے لگا۔

اس کی موجودگی سے بے خبر، آنکھیں بند کیے، پادری نے اپنی رقت انگیز دعا جاری رکھی۔ آخر کار ولولہ انگیز استدعا کے ساتھ ان لفظوں پر اسے ختم کیا اور کہا: ''اے مالک، اے خداوند، اے ملکِ عظیم اور پرچم کے محافظ، اے ہمارے باپ! ہمارے ہتھیاروں پر نزولِ برکت فرما، ہمیں فتح مندی عطا کر۔''

آنے والے نے پادری کا بازو چھوا، اسے ایک طرف ہونے کا اشارہ کیا۔ بدحواسی میں پادری نے تعمیل کی۔ اجنبی نے اُس کی جگہ سنبھال لی۔ چند لمحوں تک اس نے اپنی گمبھیر آنکھوں سے، جن میں ایک پراسرار جوالا روشن تھی، سحر زدہ حاضرین کا جائزہ لیا پھر گہری گونجیلی آواز میں کہا:

''میں تختِ علا کا فرستادہ، باری تعالیٰ کا پیغام لے کر آیا ہوں۔''

ان لفظوں سے حاضرین کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ آنے والے نے محسوس کیا ہوگا تو بھی اُس نے توجہ نہ دی، کہنے لگا:

''وہ فرماتا ہے کہ اس نے اپنے خادم، تمھارے گلہ بان کی یہ دُعا سن لی اور قبولیت عطا کی یعنی

یہ عاجز پیغام رساں اس دُعا کے مضمرات ... سارے ہی مضمرات، تمھیں سمجھا چکے گا اس پہ بھی اگر تمھاری یہی خواہش ہوئی تو باری تعالیٰ قبول فرمائے گا۔ کیونکہ انسانوں کی کتنی ہی دعاؤں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ مانگنے والا حقیقت میں جو طلب کرتا ہے دُعا اس سے زیادہ مانگ لیتی ہے۔ اس لیے ایک بار رُکنا اور سوچنا ضروری ہے۔

''خداوند کا اور تمھارا خادم اپنی دُعا کر چکا ہے۔ پر کیا یہ دم بھر کو رُکا ہے، کیا غور کیا ہے اس نے؟ اور سوچو کیا یہ ایک دُعا تھی؟ نہیں، یہ دو دُعائیں تھیں — ایک وہ جو زبان سے ادا کی گئی، دوسری وہ جو نہیں کی گئی۔ دونوں اُس سمیع مطلق کے گوشِ شنوا تک پہنچیں جو تمام التجائیں سنتا ہے، زبان سے ادا کی گئی دُعا بھی اور ادا نہ کی گئی دُعا بھی۔ یہ بات سوچو، ذہن نشین کر لو۔ جب تم اپنے لیے ایک برکت کی التجا کر رہے ہوتے ہو، خبردار! کہیں ایسا تو نہیں کہ ٹھیک اُسی وقت تم، قصد و ارادے کے بغیر، کسی ہمسائے کے لیے قہرِ الٰہی مانگتے ہو۔ اگر تم اپنی فصل کے لیے رحمتِ باراں کی دُعا کرتے ہو، جس کی اُسے ضرورت ہے، تو اس عمل سے ممکن ہے کسی ہمسائے کی فصل کے لیے، جسے باراں کی ضرورت نہیں، جو اس سے برباد ہو سکتی ہے، تم عذاب و زحمت طلب کر رہے ہو۔

''اپنے خادم کی دُعا تم نے سنی — یعنی اس کا وہ حصہ جو زبان سے ادا ہوا۔ مجھے خداوند کا حکم ہے کہ اس دوسرے حصے کو لفظوں کا جامہ پہناؤں جو پادری نے، اور تم نے بھی، اپنے دلوں میں خاموشی کے ساتھ، بہت شوق اور ولولے سے مانگی تھی اور اپنی لاعلمی میں، بے سوچے سمجھے مانگی تھی؟ خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو — تم نے یہ الفاظ سنے، 'اے مالک! اے خداوند! ہمیں فتح مندی عطا کر!' بس یہ کافی ہے۔ ادا کی گئی پوری دعا ان پُرمعنی لفظوں سے پیوستہ ہے۔ تفصیلات اور وضاحتیں ضروری نہیں تھیں۔ جب تم نے جیتنے کی دُعا مانگی، تم نے بیان نہ کیے گئے اُن بہت سے نتائج کی بھی دُعا کی جو فتح کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، لازماً ظاہر ہوتے ہیں، رہ نہیں سکتے۔ دُعا کا وہ حصہ جو لفظوں میں بیان نہ ہوا تھا سمیع مطلق کے گوشِ شنوا تک پہنچا۔ اُس نے مجھے حکم دیا ہے کہ اسے لفظوں میں بیان کر دوں۔ تو سنو! (تم نے یہ دعا مانگی کہ)۔

'''اے مالک، اے باپ ہمارے! دیکھ یہ جواں سال محبِ وطن، ہماری آنکھوں کے تارے،

دِلوں کے سرور رزم گاہ میں نکلتے ہیں، تو اُن کے نزدیک رہ! ہم بھی، اپنے پیارے گھر آنگنوں کا دل آویز امن اور شانتی چھوڑ کر، دشمن پر ضرب لگانے صورتِ جاں ساتھ چل پڑے ہیں۔ اے مالک، ہمارے خداوند! ہماری مدد کرتا کہ ہم اپنے گولوں سے اُن کے (حرامی) سپاہیوں کے چیتھڑے اُڑا دیں۔ اعانت فرما کہ ہم ان کے مسکراتے کھیتوں میں اُنہی کے مردہ محبِّ وطنوں کے زرد لاشے بچھا دیں۔ درد میں تشنج کرتے اُن کے زخمیوں کی چیخوں سے توپوں کی گھن گرج کو دبانے میں، خداوندا! ہماری معاونت فرما۔ مدد کر ہماری کہ ہم ان کے ادنیٰ گھروں کو ایک آگ کے طوفان میں نیست و نابود کر دیں۔ اُن کی بے ضرر بیواؤں کے دل ایک رنجِ لاحاصل سے اچھی طرح کچلنے مسلنے میں بارِالہا! ہماری اعانت فرما۔ اُنھیں ان کے چھوٹے بچوں کے ساتھ گھروں سے ہنکا کر بے چھت، بے یار و مددگار کرنے میں اور خود ان کی اپنی اُجڑی ہوئی زمینوں کے خرابوں سے چیتھڑوں میں لپیٹ کر بھوک اور پیاس کا سہن کراتے ہنکاتے، اور ہنکاتے رہنے میں اے مالکِ کل! ہمارا ہاتھ بٹا۔ کچھ ایسا ہو کہ وہ (سور کے تخم) گرما میں شعلہ زن آفتاب کا اور سرما میں تُند اور یخ ہواؤں کا کھیل بن جائیں۔ اپنی روح میں کچلے ہوے، جانکاہ مشقت سے تھکے ہوے، قبر کی پناہ کے لیے وہ تجھ سے التجا کریں اور جواب میں تیرا انکار ہی سنیں۔ ہماری خاطر، کہ جو تیری پرستش اور تیری ثنا کرتے ہیں، اے آقا! امیدیں ان کی خاک میں ملا دے، اُن کی زندگیاں مرجھا دے، اُن کی کڑی مسافت کو طویل تر بنا۔ بارِالٰہی! ان کے قدموں کو گراں بار کر دے، ان کے رستے میں خود ان کے آنسوؤں کا چھڑکاؤ کر اور سفید برف کو ان کے زخمی پیروں کے خون سے لالہ رنگ کر دے! ہم یہ سب اُس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر طلب کرتے ہیں کہ جو سرچشمہ ہے محبت کا، جو ہر حال میں اور ہمیشہ وفا کرنے والا دوست ہے، جو کبھی گھر جانے والوں کی اور عاجز و پشیمان دلوں کے ساتھ مدد چاہنے والوں کی پناہ گاہ ہے۔ آمین۔"

تم نے یہ دعا مانگی تھی۔ اگر اب بھی تم یہی چاہتے ہو تو کہہ دو۔ ربّ العلا کا یہ حقیر پیغام رساں انتظار کر رہا ہے۔

بعد میں لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ آدمی پاگل تھا، کیونکہ جو کچھ اُس نے کہا اُس کی کوئی تک نہیں تھی۔

تورے مالینوس اور بہت کچھ

''ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی'' کا ڈھب کچھ اس طور کا بنتا جا رہا ہے کہ مَیں راوی، یہ کہانی کہیں سے بھی سنانا شروع کر دیتا ہوں۔

تین آدمیوں کی ہماری ٹولی نے اسپین کی یاترا میں (دارالحکومت) مادرد، (پریوں کی کہانی والے castle) سگوویا اور (یونیورسٹی ٹاؤن) سَلامانکا دیکھے تھے اور اندلس کے چار شہروں مالقہ (لوگ اسے Malaga کہتے ہیں، مَیں اپنا دل خوش کرنے کو عربی تلفظ پر اصرار کروں گا) غرناطہ، قرطبہ اور اشبیلیہ کی 'زیارت' کی تھی اور ایک بار سڑک کے راستے اپنے مہربان دوست Bash Bojari (بشارت بخاری جن سے آپ مل چکے ہیں) کی کار میں بیٹھ کر ہم چوبیس گھنٹے کے لیے پرتگال کے صدر مقام لزبن جا پہنچے تھے۔

اس وقت مَیں پرتگال کے لزبن کو اور ہسپانیہ کے مادرد، سگوویا، سلامانکا وغیرہ کو کچھ عرصے کے لیے بھلاتے ہوئے بس اپنے چار اندلسی شہروں کو یاد کروں گا — بلکہ پانچ کو — پانچواں تورے مالینوس ہے۔ مالقہ سے چند کلومیٹر دور، یہ ساحلی قصبہ، تورے مالینوس (جس کے نام کا انگریزی ترجمہ Tower of the Mill ہے) مجھے بار بار یاد آ رہا ہے، یعنی یہ کہ اپنے بیان کیے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔ مالقہ کو ویسے تو مورز (Moors) کا شہر کہا جاتا ہے مگر وہاں صرف ایک اُکا زُبا (القصبہ) کے

آثار محفوظ ہیں، جہاں، کہا جاتا ہے کہ طارق بن زیاد کی آمد سے پہلے کچھ عرب کشتیاں آن رکی تھیں اور اُن کی ایک چھوٹی سی جماعت نے ایک محلّہ (یہ اُلکازبا) بسا لیا تھا۔ اِسے اب محکمۂ سیاحت نے سنبھال لیا ہے۔ خیر ہم نے پہلے مالقہ کے اس القصبہ کا چکر لگایا— کوئی زیادہ متاثر نہ ہوئے تو پروڈیوسر دوست کے مشورے پر ایک مضافاتی بس میں سوار ہو، ہم تورے مالینوس آ گئے۔

بس سے اُترے، جگہ کے نام کا ترجمہ پڑھا۔ ارے واہ! یہ 'ٹاور آوف داحل' ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں اس پون چکی کا ٹاور ہوا کرتا ہو جس پر سروانتے کے شہرۂ آفاق کردار، ڈون کیہوٹے نے بلہ بول دیا تھا اور نتیجے میں ہوا چکی کے بھاری پنکھوں (یعنی دیو کے بھیانک بازوؤں) کی جھپیٹ میں آ کر موصوف زخمی ہو گئے تھے؟

میں نے دوستوں کو اپنے گمان سے آگاہ کیا اور سارا دن اُنھیں اسی بدگمانی میں رکھا۔

رات پڑے بس میں بیٹھنے لگے تو میں نے ایمانداری سے قبول دیا کہ نہیں یہ وہ جگہ نہیں ہو سکتی۔ سروانتے کی کہانی کا venue یہ نہیں تھا۔ پروڈیوسر کہنے لگے، "ہم نے کون سا یقین کر لیا تھا، ہم تو تمھیں خوش کرنے کو ہاں میں سر ہلا رہے تھے۔ ہاہاہا!" (مجھے بھی اخلاقاً ہنسنا پڑا) یہ بستی Costa Del Sol یعنی "ساحلِ شمس" پر ہے۔ گویا بحیرۂ روم کا سامنا کرتے، ہسپانیہ کے دھوپ بھرے جنوبی ساحل پر بسی ہے، جہاں تقریباً سارے سال (بیشتر) شمالی یورپ کے دھوپ سے محروم ٹورسٹ جمگھٹا کیے رہتے ہیں۔

مالقہ میں اور یہاں پہنچتے ہی چہرے گھما کر دیکھو تو ایک ہی سا منظر دکھائی دیتا ہے۔ بلند و بالا تعمیرات جن پر شوخ رنگوں میں پینٹ کیے گئے بل بورڈز اور جلتے بجھتے نیون سائنز جن پر ہوٹلوں کی آسائشوں اور نائٹ کلبوں کے sizzling مناظر کے اشتہاروں پہ اشتہار۔ مجال ہے ساحلِ شمس کی ذرا بھی جھلک دکھائی دے جائے۔

میں نے کہا، "کسی سے پوچھ کے آتا ہوں، یہ ساحلِ شمس آخر گیا کہاں؟"

پروڈیوسر، جو نیویارک اور لاس ویگاس میں بالترتیب رہائش رکھتے اور کاروبار کرتے ہیں، پہلے ہنسے، پھر انکار میں سر ہلا کے بولے کہ بڑے بھائی! کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی چیزیں بیچنے والے اور رہائش اور sizzling night life اور گائیڈڈ اور unguided tours کا اہتمام کرنے والے لوگ

قیامت ہوتے ہیں۔ یہ اچھے اچھے ساحلوں اور جلوے والی جگہوں سے متعلق ہوائی جہازوں، ریلوں اور بسوں کے تمام اڈوں کے گرداگرد کانکریٹ، شیشے اور اسٹیل اور گوشت و پوست کے حصار بنا دیتے ہیں اور اس طرح ساحلوں اور جلوے والی جگہوں کو اُس وقت تک 'حجاب' میں رکھتے ہیں جب تک کہ خود ان چھچھوروں کی 'بوہنی' نہ ہو جائے۔

ڈائریکٹر نے جماہی لے کر کہا، ''بھائی جان، دنیا روز بروز مادیت پرست اور خود کو ضرر پہنچانے والی ہوتی جا رہی ہے۔'' پھر وہ نیند سے لڑتے ہوئے سر جھٹک کے بولے، ''خیر، پہلے سگریٹ ماچس پکڑ لیں... پھر دیکھتے ہیں کیا کچھ کرنا ہے۔''

ہم دو ہنسنے لگے تو وہ بھی ہنسے پھر ہم tobacconists کے گلیارے میں گھسے پھر برابر کی (؟) sex equipments اور نیلی فلموں کے کیسٹس کی کشادہ دکان کو تجسس (اور برہمی) سے گھورتے ہوئے ساحل شمس کی طرف اُترنے والی سیڑھیوں پر ہو لیے۔

دس منٹ تک اِدھر اُدھر بھٹکتی سیڑھیوں کے پیچیدہ نظام سے الجھتے ہوئے، ہم ساحل پر پہنچ گئے۔ تو گویا یہ Costa Del Sol ہے؟ ہاں جناب؟... اور یہ اپنا بحیرۂ روم ہے؟ اے سبحان اللہ!

مجھے یاد آیا ایک اندلسی جغرافیہ داں الادریسی نے کوئی ہزار نو سو برس پہلے Mediterranean کا نقشہ بنایا تھا۔ حکیم محمد سعید صاحب مرحوم نے کسی کتابچے میں اسے بہت اہتمام سے چھپوایا تھا۔ کتنے ہی دن مَیں اسے اٹلس کے ساتھ رکھ کے دیکھتا رہا۔ 80/85 فیصد درست تھا۔

کچھ دیر اپنی محویت میں ہم تینوں خوشگوار دھوپ میں لہرتے Mediterranean کو دیکھتے رہے پھر بیک وقت تینوں کو خیال آیا کہ کہیں بیٹھ جائیں اور ذرا جم کے دیکھیں۔ اب جو مڑ کے اپنے عقب میں دیکھتے ہیں تو سمجھو تینوں پتھر کے ہو گئے۔

جہاں تک نظر کام کرتی تھی ریستورانوں، ہوٹلوں، کرسیوں پڑے چبوتروں، ہاتھ گاڑیوں اور کھوکھوں کا ایک جیشِ عظیم بحیرۂ روم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، آپس میں کندھے سے کندھا بھڑائے، جیسے یلغار کرنے پر تُلا کھڑا تھا۔ ہم تینوں منہ ہی منہ میں کچھ بک جھک کے، بُدبُدا کے رہ گئے۔ ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ پروڈیوسر دوست کے بیان کیے ہوئے بھیانک تجارتی حصار کا

آؤٹر پیری میٹر تھا اور یہ چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا کہ بھیا جی! دریا پہاڑ گھاٹیاں اور سایہ دار شجر اور گم صم گپھائیں اور جھیلیں اور جھیل میں ہنستے نیل کمل اور اپنی چھبی دیکھتے چندرماں کسی کے باپ کے نہیں ہیں۔ جس کا جی چاہے ٹیکس دے کے یا بنا ٹیکس دیے بھی یہاں اپنا 'کھوانچا' لگا سکتا ہے۔ جاؤ تمھاری ایسی کی تیسی!

سو پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ ایک کشادہ دل ساریستوران چن لیا، کچھ دیر کو وہاں ٹھیکی لی، تازہ سوفلے منگائے، چائے پی، خوش کام ہوئے اور چل نکلے۔ ساحل پر لمبی ٹہل لگانے کا وقت ہو گیا تھا۔

ساحل پہ وہی سب تھا جو یورپ کے ساحلوں پر ہونا چاہیے تھا۔ ہمیں نہاتے، غسل آفتابی کرتے یا دھڑلے کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف جوڑوں سے بس اتنا ہی 'شغف' تھا کہ ہم پاکستانی سنسر کی حدیں پہچان کر بعض مجوزہ مناظر کو اپنے مجوزہ سیریل کے لیے approve یا dis-approve کرتے چلے جا رہے تھے۔ پروڈیوسر کا خیال تھا کہ یہ سارا footage ڈالنا خوب رہے گا۔

ڈائریکٹر دوست کا مؤقف تھا کہ یہ سب جو یہاں سے وہاں تک ہو رہا ہے اس سے اپنے average ناظر کو شمہ برابر دلچسپی نہیں ہے۔ یا شمہ بھر ہوئی بھی تو مجھے بہ حیثیت ہدایتکار اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے — کیوں اسد بھائی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟ جس پاکستانی کردار کو ہم یہاں لائیں گے اُس کی پہلی ترجیح —sorry—

میں ہدایتکار دوست کی پوری بات نہ سن سکا، کیونکہ بالکل سامنے ساحل کی ریت پر مجھے یسوع دکھائی دیے تھے۔

اپنی ان گنت شبیہوں کی طرح وہ صلیب پر تھے اور ہمیشہ کی طرح ان کا سجاؤ abandon کا — یعنی مکمل سپردگی کا سجاؤ تھا کہ الوہی! —

"میں تیری رضا میں راضی ہوں۔"

"او مائی گاڈ! یہ کیا ہے؟ بھئی... سُبحان... اللہ!"

"کم... ما آل ہے یار!"

کسی نے ساحل کی ریت میں انسانی قد کے چوگنے اسکیل پر جی زَرْ کی bas-relief—

اُبھرواں شبیہہ — بنائی تھی۔ صلیب پر کیلوں سے ٹھکی ہوئی اُن کی ہتھیلیاں اور اُن کے پیر، ریاضت سے دُبلایا ہوا ان کا زخمی Torso... اور وہ چہرہ! بہت بڑے دُکھ میں اور مکمل سپردگی کے ساتھ (اور جیسا کہ میں نے کہا) راضی بہ رضا۔

ہم نے ایک تحیّر میں شبیہہ کے پاس جا کر دیکھا کہ ریت کو تھوڑا کچھ 'ثبات' دینے کے لیے بنانے والے نے، اسے کسی طرح کے 'نظر نہ آنے والے' گوند میں گوندھ لیا تھا کیونکہ سمندر سے خشکی کی جانب آنے والی ہوا اُبھرواں شبیہہ کو چھیڑ ضرور رہی تھی... اسے مٹا نہیں پاتی تھی۔ ہوا اپنے ساتھ ریت لا رہی تھی جس نے bas-relief کے آغاز پر (یعنی جی زز کے 'کانٹوں کے تاج پر') بادل سے بنا دیے تھے۔ میں نے دل میں کہا، "اسد خانا! ہوا تو اسے ری ٹچ اور improve کر رہی ہے۔"

Mediterranean کی ہوا صورت گری جانتی ہے — صورت گروں کی محرم ہے۔ اطالیہ اور یونان اور کہاں اور کہاں کس کس سے اس کی شناسائیاں رہی ہیں۔

پھر ہمیں یسوع کے قدموں میں، کچھ دور، ریت میں، ریت کا ایک پیالہ سا نظر آیا۔ پیالے میں ہسپانوی peseta اور یورو اور پینی اور فرانک اور طرح طرح کے سکّے پڑے تھے۔ پروڈیوسر نے، جو یہ سب دیکھ کر (شاید) آبدیدہ ہو گئے تھے — جھک کر، احترام کے ساتھ ڈالر کے دو سکّے پیالے کی ریت میں کھونس دیے (دوسرے دن بتانے لگے کہ سکّے "شگن" کے تھے۔ شبیہہ ساز کے دن پھر جائیں گے)۔

خیر، بھوک لگ رہی تھی تو ہم نے طے کیا کہ بحیرۂ روم کا براہ راست سامنا کرتے کسی ریستوران، ہوٹل، نانبائی، مطبخ یا 'کھوانچے والے' کی طرف جانے کی بجائے سیڑھیاں چڑھ کے اصل حصار میں پہنچا جائے۔ وہاں ہمیں کچھ افریقی، ایشیائی صورتیں دکھائی دی تھیں۔ ہو سکتا ہے کچھ اچھی اور kosher غذا بھی مل جائے۔

کسی بھی سیڑھی کے پیچیدہ نظام سے اوپر پہنچتے ہوئے ایک مسکین فوٹو شاپ سے مناسب داموں میں فلم رول خریدتے اوپر آئے تو دیکھا یہ وہ جگہ ہی نہیں ہے جس سے یہاں آتے سامنا ہوا تھا — قصبہ بے شک تو رے مالینوس تھا۔ مگر ہم بھٹک گئے تھے۔ ویسے ہم نے سن رکھا تھا کہ مسافرت میں

بھٹکنا کبھی کبھی اچھا ہوتا ہے۔

اس وقت بھی اچھا ہی ہوا، سوگرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے ہدایتکار دوست بولے، ''سبحان اللہ!''

ہم نے دیکھا کہ شوخ و شنگ لڑکے لڑکیوں کا ہنستا کھلکھلاتا ہجوم ایک کیوریو شاپ سے انبار وں عجائب و غرائب خرید کے نکل رہا تھا۔ بعض چیزیں، جنھیں وہ شرارتاً کندھوں یا سروں پر اٹھائے ہوئے نمائش کرتے نکلے تھے، دیکھنے میں اچھی لگیں تو ہم تینوں اس دکان میں جا گھسے۔

وہاں ہر برِاعظم کی نمائندگی ہو رہی تھی۔ ایشیا کی بہت سی چیزیں تھیں۔ اپنے پاکستان کی شیشم کی insetوالی چھوٹی بڑی صندوقچیاں بھی نظر آئیں، لمحے بھر کو nostalgic ہوئے، انھیں خوش ہو کے ہاتھ لگایا اور آگے بڑھ گئے۔ ہندوستان سے منگائی ہوئی راجستھانی گڑیوں کو دیکھتے، پسندیدگی میں سر ہلاتے ہم نے پوری دکان کا چکر لگایا۔ پروڈیوسر نے کسی افریقی علاقے سے آئی بالشت بھر کی ایک بھدی مورتی خریدی جو سیاہ لکڑی میں تراشی گئی تھی۔ مجھے تو یہ ایک موٹے، ننگ دھڑنگ witchdoctor (یا شامان) کا caricature لگتا تھا۔ دکاندار کہنے لگا کہ زولولینڈ کے لوگ ارواحِ خبیثہ کو دوڑا دینے کے مقصد سے اسے گھروں میں رکھتے ہیں۔ یہ جہاں بھی 'استھاپت' کی جائے گی اس سے مشرق، مغرب، جنوب اور شمال کے چار چار گھر بھی ارواحِ خبیثہ کے اثرات سے محفوظ رہیں گے۔'' اے سبحان اللہ!''

پروڈیوسر دوست بتانے لگے کہ انھوں نے یہ مورتی میرے لیے خریدی ہے تاکہ میں 'کُتّی جیسی' روحوں سے محفوظ رہتے ہوئے سکون سے ان کا سیریل لکھ سکوں۔ مَیں نے کہا ناں دوست، مَیں یہ نہیں لے سکتا۔ مَیں ڈراموں، سیریلوں کے اسکرپٹس ارواحِ خبیثہ کے درمیان بیٹھ کے لکھتا ہوں۔ یہ 'شامان' اگر میرے گھر میں رہا تو آپ کے سیریل کا کام کبھی مکمل نہیں ہونے کا۔

پروڈیوسر نے ہدایتکار کو آمادہ کرنے کو کہا کہ برادر! تم لے جاؤ۔ باقی عمر آرام سے رہو گے۔ وہ بولے، یہ تو اچھا ہے کہ میرا گھر بلّیات سے بچا رہے گا۔ لیکن میں اپنے بالکل شمال اور ایک دم مشرق میں بسے ہوئے دو منحوس ہمسایوں کو کسی بھی صورت میں — ہرگز ہرگز — ارواحِ خبیثہ سے بچانا نہیں چاہتا۔ کوئی ایسا جادو منتر ہوتا تو میں شکریے کے ساتھ قبول کر لیتا کہ جو مجھے تو منحوس اثرات سے محفوظ

رکھے مگر میرے امی جی ایٹ شمال اور مشرق کے پڑوسیوں، سالوں کا ٹیپا کر دے۔ وہ واقعی سنجیدہ تھے۔ اس لیے مجبوری تھی۔ کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

ہم خاموشی سے آگے چل پڑے اور ایک تنگ و تاریک hovel میں، جو کیفے لگتا تھا، داخل ہو گئے۔ وہاں سناٹا تھا۔ ایک طرف ایک اکیلا آدمی بیٹھا کوئی مشروب sip کر رہا تھا۔

مشروب سپ کرنے والا ہمیں اور ہم اسے 'آدھی بے تعلقی' سے دیکھتے رہے۔ ہمارا دیکھنا کچھ بیزاری کا بھی تھا، ہم جلدی میں تھے کس لیے کہ ہمیں کیفے کے مالک، ویٹر، کک — یعنی کسی کا بھی انتظار تھا۔ اُس آدمی کو بالکل جلدی نہیں تھی، کیونکہ اس کا پسندیدہ مشروب اور بہت سا وقت اُس کے پاس تھا۔

بالآخر اس نے اپنا مشروب ختم کیا، ہمیں اَدھ کھلی آنکھوں سے دیکھا، اُٹھا — پھر عجب کام کیا — اس نے گلاس اٹھایا اور پینٹری میں چلا گیا — لمحے بھر میں واپس آیا تو وہ ایپرن باندھے تھا اور menu کی پلاسٹک چڑھی رنگارنگ شیٹس اس کے ہاتھ میں تھیں، بازو پر پڑا سفید نیپکن چمک مار رہا تھا۔

وہ خبیث یہاں ملازم تھا... اور اب ہماری طرف آ رہا تھا۔

پروڈیوسر، جو ڈھیر ہوئے پڑے تھے ایکدم تن کے بیٹھ گئے۔ اُن کا چہرہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اشتعال میں آ سکتے تھے۔ ہدایتکار نے ان کے چہرے پر ایک بار نظر ڈالی اور بے سوچے سمجھے بل بل کے ہنسنا شروع کر دیا۔ پھر ویٹر کی طرف دیکھ کر، کہ جو ہمارے بہت قریب پہنچ گیا تھا، وہ دِلّی آگرے کے محاورے میں کہنے لگے، ''ابے بھوتنی کے! یہاں بھوک کے مارے آنتیں قل ھواللہ پڑھ رہی ہیں اور تم گھنٹے بھر سے ہماری صورت کے سامنے بیٹھے شرابیں پی رہے ہو! That's great, really great!.. ہاہاہا۔ سالے!''

ویٹر نے پہلے بہت کوشش کر کے اُن کی بات سمجھنا چاہی، اور پریشان ہوا — پھر جیسے ہی انگریزی کی مانوس آوازیں سنائی دیں، اس نے دانت نکال دیے اور جاپانیوں کی طرح بہت گھبرا جھکتے ہوئے اس نے بار بار ''تھینک یو، تھینک یو، یس سر! ریالی گریٹ'' کہا اور ... ہدایتکار دوست کی طرح، زیادہ کچھ سوچے سمجھے بغیر، ہنسنا شروع کر دیا۔

پروڈیوسر نے یہ سب دیکھا، اچانک غصہ تھوک دیا اور سب کی آواز میں آواز ملا کر،" ریالی ریالی گرریٹ" کہتے ہنسی میں شامل ہو گئے۔

معلوم ہوا اس کی شفٹ بارہ بجے شروع ہوتی تھی۔ بارہ بج کر ٹھیک ایک منٹ ہوا تھا۔ وہ اسی کیفے سے خریدے گئے مشروب سے لطف اٹھاتے ہوئے اپنی شفٹ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا،"سوری مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تم پاکستانی ہو تو میں بارہ بجے کے انتظار میں نہ بیٹھا رہتا۔ تمھیں اٹینڈ کرتا۔"

پروڈیوسر نے پوچھا کہ پاکستانیوں میں ایسی کیا بات ہوتی ہے؟ رازداری سے جھک کر کہنے لگا، "تم لوگوں نے پروا نہیں کی، بم بنا لیا۔"

"مگر یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے بھائی!" میں نے جیسے ذمہ داری کے بوجھ سے لرزتے ہوئے کہا،"تمھیں ہیروشیما، ناگاساکی یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے، جبھی کہہ رہا ہوں کہ اچھا کیا، بنا لیا۔ کچھ لوگوں کی طرح تم فضول لوگ نہیں ہو۔ آدمی کی جان کی قیمت بھی سمجھتے ہو۔ اچھا کیا۔"

میں نے کہا کہ یہ اتنی آسان اور سرسری بات نہیں ہے، اس پر پھر گفتگو ہوگی۔ گھڑی دیکھ کر کہنے لگا،" رات آٹھ بجے تک یہیں ملوں گا۔ آ جانا۔"

ہم آٹھ سے پہلے اُدھر سے گزرے تو جاننے والے مراکشی نے ہاتھ ہلا کے بلا لیا۔ وہ اپنے کیفے کے یہودی مالک سے ہمیں ملوانا چاہتا تھا۔ ہم تینوں نے کوئی اہمیت نہیں دی تو اس نے اصرار سے کہا، مل لو، میں نے تمھارے بم کی خبر پڑھ کے اخبار سب سے پہلے اسی کو دکھایا تھا۔ انھیں بھی تو پتا چلے۔ پروڈیوسر نے کہا،" سو؟ ...وھاٹ؟ ...تم ابھی تک بم سے چمٹے ہوئے ہو؟" ہدایتکار نے بات آگے بڑھائی،" ...نہ صرف چمٹے ہوئے ہو بلکہ اُس ... (وہ کسی طرح کا نسلی حوالہ دُہرانا نہیں چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے اور ہی ناگفتہ بہ لفظ کہا) اس فلانے کو بھی چمٹائے ہوئے ہو۔"

میں بولا،" ہٹاؤ اُسے! کیا بات کرتے ہو؟ Classified چیزوں کے اتنے قریب ایروں غیروں کو نہیں لاتے۔"

وہ کچھ نہیں سمجھا تو پروڈیوسر نے انگریزی میں 'منی پاؤ' جیسی کوئی بات کہہ دی، پھر اسے سمجھایا کہ وہ جہاں سے آرہے ہیں وہاں انھوں نے بہت یہودی دیکھے ہیں۔ enough is enough اور پھر اس موضوع پر ہمارا مکالمہ ختم ہوگیا۔ اور باتیں شروع ہوگئیں۔ ویسے یہ مراکشی نوجوان ہمیں اچھا لگا تھا۔ پھر کبھی تورے مالینوس جانا ہوا تو اسے تلاش کریں گے۔

مرزا جی! اب خطوں اور ای میلوں کا ایک کولاج (Collage) بناتا ہوں۔ ادیبوں کو لکھے گئے تین خط ہیں سال 76، 85، اور 91، کے اور اگست ستمبر 2004، کی تین ای میلز ہیں جو میری ایک مجوزہ کہانی ''مہامائی کا ہریا'' کی صورت گری کے مراحل بیان کرتی ہیں اور یہ دکھاتی ہیں کہ کس طرح اُس کہانی نے آخر کار ایک مجوزہ ناول، کا چولا پہننا شروع کیا ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔

28-6-76

اسد محمد خاں 8/936 عزیز آباد، کراچی 38۔ پاکستان۔

سید محمود خان ہاشمی (in fact Mahmood Hashmi) سلامت باش!

تم نے ساقی فاروقی کے ہاتھ رسالہ دنمان بھیج دیا، نوازش۔ اور تم پھر غائب ہو گئے۔ کیا مصروف ہو؟ میں نے دِلّی سے آکر دو کہانیاں اور لکھی ہیں۔ ایک پرسوں حلقے میں پڑھ رہا ہوں۔ شاعری کا کام بدستور رُکا ہوا ہے، نثر لکھنے میں لطف آرہا ہے۔ شاعری کے نام کا قرض دوسری زبانوں سے ترجمہ کر کے اُتار رہا ہوں، فی الحال۔ خیال ہے کہ اس سال اپنا پہلا اور آخری شعری مجموعہ لے آؤں گا۔ پندرہ برس میں جو کچھ کیا ہے ایک جگہ لکھ کر خود دیکھوں گا تو اندازہ ہوگا کہ کیا ہے اور آگے کے امکانات کیا ہیں (تمھیں معلوم ہے میں بے اُجرت کی حمالی کا قائل نہیں ہوں)۔

اب یہ اس وجہ سے ہے کہ میں خود شعر نہیں کہہ رہا اور نثر کی طرف راغب ہوں یا حقیقت میں صورتحال بدل رہی ہے۔ ویسے تم نے خود اندازہ لگایا ہوگا کہ شعر کی سلطنت اُکھڑتی نظر آتی ہے۔ یہاں اور تمھارے ملک میں، دونوں جگہ، بڑی کسمپرسی کا سا عالم ہے۔ بھائی سلیم احمد کا بھی خیال یہی ہے کہ شعر کی سلطنت تاراج ہونے کو ہے اور اب جو یہ صدی آنے کو تیار بیٹھی ہے، نثر کی صدی ہے۔

واللہ اعلم! ویسے ہمارے یہاں تو ادب ہی کا ملک تاراج ہوتا نظر آتا ہے۔ ٹیلی وژن اور ڈائجسٹ نے ادب سے قاری چھین لیے۔ مطالعے کا اور غور کرنے کا وقت کسی کے پاس نہیں رہا۔ ادب اور علم کے ready reckoner اس کاوش کی جگہ لے رہے ہیں جو رُبع صدی پہلے لکھنے پڑھنے والوں کی زندگی تھی۔ یا شاید ہم بوڑھے ہو رہے ہیں۔ یا پیمبری سال لگ گئے ہیں سب کو۔ by the way تم دِلی والے ہو، کبھی بتانا ٹکسالی زبان میں پیمبری سال کے کیا implications ہیں؟

اب ظاہر ہے مڈل ایجڈ لوگ تازہ دم نسل کی طرح چلت پھرت تو نہیں لا سکتے۔ مگر برادرم! تازہ دم نسل کہاں ہے؟ وہ لوگ کون ہیں جو لکھنے پڑھنے کے کام کو جاری رکھیں گے؟ ہمارے یہاں کے تازہ دم لڑکے تو بنکوں میں افسری، خلیج کی ریاستوں میں ملازمت یا فلم ٹیلی وژن میں ایک چانس کے منتظر بیٹھے ہیں۔ اور جو لکھنے پڑھنے کے کیڑے سے کاٹے جا چکے وہ لیکچررشپ سے آگے سوچنے سے انکار کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ ہمارے یہاں لیکچرر فرسٹ کلاس گزیٹڈ پوسٹ ہے۔ سات سو روپے basic pay گروپ سترہ کا اسکیل اور الاؤنسز وغیرہ ملا کر بارہ ساڑھے بارہ سو روپے اور پھر increment اور re-grouping اور لیکچررز یونین اور ٹی وی میں پروگرام کومپئیرنگ کا چانس اوف اوف۔ یار محمود ہاشمی! کیا ہم ہی... تیا تھے کہ انکریمنٹ اور ری گروپنگ اور فلموں میں چانس اور اوف اوف نہ کر پائے؟

تمھارے یہاں میں نے لکھنے پڑھنے والوں کی اکثریت کو سلیم، جاوید صاحبان کی طرف حسرت سے دیکھتے اور 'کاش کاش' کرتے سنا ہے اور یہاں کا لوئر مڈل کلاس کا لڑکا سیدھا بینک کی کرسی کی طرف لپکتا ہے۔ یا پھر اُسے لیکچررشپ یا خلیج کی ریاستیں بلا لیتی ہیں۔ ذہین لڑکیاں microbiology اور medicine جیسے شعبوں میں جان کھپانے اور تقریباً مڈل ایجڈ ہونے کے بعد شادی کر لیتی ہیں اور شادی کے بعد بڑی یکسوئی سے اچاروں، چٹنیوں اور سوئیٹر کے چار سیدھے دو الٹے پھندوں کا لٹریچر جمع کرتی ہیں اور قسم ہے جو اپنے مضمون یا انسانی تاریخ یا ادب یا زندگی سے ایک سطر پڑھنے کا موقع آنے دیں۔ پھر اُن کی ٹھوڑیاں دہری اور تہری ہو جاتی ہیں اور وہ درودِ تاج پڑھتے پڑھتے اللہ کو پیاری ہو جاتی ہیں — چلیے چھٹی ہوئی۔

راقم کو ہرگز درودِ تاج پر کوئی اعتراض نہیں۔ پڑھیے، آپ میں سے خدا جسے توفیق دے، ضرور پڑھیے۔ مجھے کہنا شاید یہ تھا کہ یہ بھی پڑھو اور کولرج کی قبلائی خان بھی اور ابن رشد بھی، وما توفیقی الا باللہ۔

ان پندرہ برسوں میں کہ میں لکھنے پڑھنے کے ایرینا میں مسخرہ پن دِکھا رہا ہوں، میں نے بڑے بڑے نابغوں کو بگل بجا کر ادب اور شاعری کے میدان میں آتے دیکھا اور پھر وہ اچھے بچوں کی طرح کہیں اور کیریئر بنا کر چلے گئے۔ یا 37، 38 سال کی عمر میں جب ذرا کمفرٹیبل حالات ہوئے تو بعض نے قلم دوات دھو کر کاغذ پھیلائے اور اسلامی سوشل نظمیں اور اسلامی سوشل کہانیاں یا سیکولر (تقریباً سرخ) سوشل ادب اور قومی یکجہتی لکھنے کا جتن کیا (جو زندگی کے پورے پھیلاوے کا minimal ہو تو ہو، پوری زندگی ہرگز نہیں۔ یا میں اس طرح سوچتے ہوئے غلطی پر ہوں؟ میں نے USSR کی حیاتِ مستعار میں رشین لٹریچر کی committed کہانیاں اور نظمیں خوب پڑھی ہیں۔ مختصر یہ کہ بخ!)۔

تو اب اپنے narration کو وہیں سے پکڑتا ہوں جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا — کہ قومی یکجہتی لکھنے کا جتن کیا اور مدیروں کو ذرا دھمکا کر اپنے سرکاری/فوجی رعب میں لے کر یا اشتہاروں کی رشوت دے کر ممتاز جگہ چھپنے کا بندوبست کر لیا اور بعض نے تو یہ کمال بھی کیا کہ ایک یا دوسرا یا تیسرا ادبی انعام بھی ہتھیا لیا۔ خود پر مضمون لکھوا لیے اور امیرِ شہر کی مسند کے قریب جا بیٹھے اور ادب ودب پر فیصلے صادر کرنے لگے۔

فراق گورکھپوری کو کس خدا کا حکم ہے جو وہ ہم ایسے اور تم ایسے مڈل ایجڈ لوگوں کو ستا رہے ہیں۔ ارے بھئی سلیم احمد ہمیں ہینگ کی آڑھت کیوں نہیں کرنے دیتے اور رگھوپتی سہائے فراق صاحب قبلہ آپ نے تو اپنی عمر گزار لی، اپنے بگل بجوا لیے اب اس سیّدزادے، ہاشمیوں کے چشم و چراغ محمود میاں غریب کو اور اس الف میم نے کو retarded بچوں کی طرح منہ کھولے زانوے ادب تہ کیے اپنے سامنے کیوں بیٹھنے دیا ہے؟ ارے اُٹھا دیجیے انھیں، چھٹی کیجیے ان کی۔ کھانے کمانے موج اڑانے دیجیے نُسروں کو۔

یہ نہیں ہے محمود! میری جان! کہ ہم یا تم یا ہمارے تمھارے بچے، خدانخواستہ روزے پر روزہ رکھ

رہے ہیں۔ مالی تکلیف میں ہیں۔ ناں بھئی ناں، بہت مزے میں ہیں۔ پیٹ بھر کھاتے ہیں، من پسند پہنتے ہیں۔ سو سو دو دو سو کی کتابیں بھی خرید لاتے ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ ہیرلڈ روبنز کی طرح ذاتی طیارہ نہیں ہے۔ مگر سوال وہی پرانا دہراؤں گا کہ وہ نئے لڑکے کہاں ہیں جنھیں ہمارے سانحۂ ارتحال کے بعد لکھنے پڑھنے کا یہ کام کرنا ہے؟ کیا ہماری سماجی صورتحال اور مالی حیثیت اتنی عبرتناک سمجھی جاتی ہے کہ لوگ lepers کی طرح ہمارے گلوں میں گھنٹیاں ڈال کر دور دور بھاگ گئے ہیں؟ یا اس رخصت ہوتی ہوئی بیسویں صدی کے معیارات پلک جھپکتے میں بدل گئے؟ کل تک تو لکھنے والے محترم سمجھے جاتے تھے۔

مجھے معلوم ہے میں بڑی میڈیوکر باتیں کر رہا ہوں۔ مگر تکلیف میں ہوں اور اپنے ساتھ کے لوگوں کو تکلیف میں دیکھ رہا ہوں اس لیے یہ باتیں کر کے اپنا system صاف کر لینا چاہتا ہوں۔ گاہے گاہے ضروری ہوتی ہیں یہ باتیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے بہت اچھے دوست جو بہت اچھا لکھ رہے تھے۔۔بقول کسے بہت اچھے جا رہے تھے status کی rat race میں کام آ گئے۔ بڑے بڑے ہونہار جو اچھی اچھی نظمیں کہانیاں غزلیں لے کر آتے تھے اب یہ خبر وحشت اثر سناتے آ رہے ہیں کہ بھائی! 150-50-700 EB-2500 کے گریڈ میں آ گئے ہیں ہم۔ ڈپٹی کمشنر کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ گوشت سبزی اور دودھ اسٹوڈنٹس کے وہاں سے مفت آ جاتا ہے۔ فرسٹ کلاس گزیٹڈ پوسٹ ہے۔ ہم اب کیریکٹر سرٹیفکیٹ پر دستخط کر سکتے ہیں...

...اور پاسپورٹ بنوا لیا آپ نے؟ ہم پوچھتے ہیں بچہ جمورا! کوئی غزل کہانی نظم لکھی؟ کچھ نیا پڑھا؟ ارشاد ہوتا ہے کہ پرنسپل یا ڈی سی مہربان بہت ہے، بڑی ذمہ داریاں ڈال دی ہیں میرے سر (یعنی اب یہ ادب لکھنے پڑھنے کا غیر ذمہ دارانہ کام نہیں کر سکے گا)۔ اِنا لِلّٰہِ وَ اِنا الیہِ راجعون۔ تو بھائی ہاشمی! اندھوں کے آگے رومیاں! اور بین بجا بھینس کے آگے۔ یا بدھیا بھینسا بیل شتر اکٹھا کر بھائی۔ کیوں جانِ عزیز گنواتا ہے؟

اب یہ بھی سُن:

قلندروں کے قلندر، میرے یار نے 32 ہزار کی گاڑی خریدی تھی، پانسو روپے کا ڈرائیور نوکر رکھ لیا ہے۔ تیس ہزار کی زمین پر ڈیڑھ لاکھ کا مکان بنوا رہا ہے۔ موجودہ فریج چھوٹا پڑ رہا ہے، دوسرا خریدے گا۔ اس کی بیوی نے دو ہفتے پہلے سری لنکا سے گوتم بدھا رتھ کا ہاتھی دانت کا بت خریدا تھا۔ بت چار سال کے بچے کے قد اتنا ہے۔ ایک رسالے میں اُس بی بی نے لکھا ہے کہ وہ ادب کی آدمی ہیں زیورات وغیرہ بھی خرید سکتی تھیں مگر انھوں نے نہیں خریدے کیونکہ مسئلہ کلچر کا ہے اور ہائی تھنکنگ کا... کہ بُدھاں شرناں گچھاں می... میں عالم پناہ بُدھ کی شرن میں آتا ہوں۔

مگر یہ sarcasm نہیں سیدھی سیدھی jealousy ہے جو مجھ سے یہ سطور لکھوا رہی ہے۔ (کیا سچی بات لکھی تھی خاں صاحب نے۔ اب سوچتا ہوں کہ میری یہ sermonizing ایک جھلسے ہوئے have-not کی بڑبڑ تھی۔ اس تحریر کے سولہ سترہ برس بعد جیسے ہی موقع ملا الف میم خے نے exactly وہی سب کر دکھایا۔ یعنی گاڑی [اور شروع میں] ڈرائیور، زمین، مکان یہاں تک کہ فریج کی بدلی تک بالکل اُسی طرح وقوع پذیر ہوئی)۔

خیر تو جیلسی ہے جو مجھ سے یہ سطور لکھوا رہی ہے۔ کمینہ آدمی ہوں اس لیے کڑھ رہا ہوں۔ میرے اندر کوئی بدھیا بھینسا بیل شتر جمع کرنے والا خبیث بیٹھا ہوا ہے۔ جو بڑا فریج اور ڈرائیور اور گوتم (؟) رکھنا چاہتا ہے اور ہیرلڈ روبنز کی طرح اپنا ذاتی طیارہ خود اُڑانا چاہتا ہے۔

تو ہم تم ایسا کرتے ہیں محمود خاں! کہ ایک بھوت ڈائجسٹ نکالتے ہیں اور اس میں بھوتوں سے مُچیٹوں کے ذاتی تجربے، برما کے پاگل ہاتھی اور کھٹمنڈو کے آدم خور شیر کے شکار کے قصے اور مارلن برانڈو اور راکیل ویلش کے fornication کے ساگا پر اور امریکا کے کسی بھی ملٹی میلینئر کی eccentricity اور اولیا اللہ کے mini adventure پر مواد جمع کرتے ہیں۔

سلیم احمد اور فراق کو، عسکری اور علی عباس جلالپوری کو، خلیل الرحمان اعظمی اور سیّد عبداللہ کو، علی عباس حسینی اور انور سجاد کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ آئیں اور برما کا پاگل ہاتھی شکار کریں، آدم خور کا جبڑا توڑیں، برانڈو صاحب کو fornicate کرتے دکھائیں۔ میرا خیال ہے اولیا اللہ کے منی ایڈونچر پر انور سجاد کو، راکیل ویلش کی سُلگتی راتوں کی تفاصیل پر حسینی اور جلالپوری کو اور ہاتھی، شیر وغیرہ پر فراق، عسکری یا

سلیم احمد کو مامور کیا جائے۔ ملٹی میلینیئر سے اعظمی اور ڈاکٹر سید عبداللہ نمٹ لیں گے۔ کہو کیسی رہی؟

بھائی عمیق حنفی سے سلام کہنا۔ نیت یہ تھی کہ ان کے نام ایک عریضہ اسی لفافے میں روانہ کروں گا مگر اس الارم کلاک کی طرح کہ جس میں ضرورت سے زیادہ چابی بھر دی گئی ہو، چل پڑا اور اتنا کاغذ خراب کر دیا۔ میری طرف سے شکریہ ادا کر دینا، انھوں نے مجھ ایسے بے نوا کم آمیز پر اتنا کچھ لکھ دیا۔ محبت ہے ان کی۔ میں نے رگھوویر سہائے، سرویشور دیال اور شری کانت ورما کو خط لکھے ہیں۔ باقی بھائی سے شرمندہ ہوں، جب تک ایک اور چکر دِتی کا نہیں لگا لیتا شرمندہ ہی رہوں گا۔ کس محبت سے یہ سب لوگ ملے تھے۔ محبتوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا ورنہ ایک ایک کو خط لکھتا اور شکریہ ادا کرتا۔

ہاں، ساقی ایک لفافہ لایا تھا جو ہماری بھاوج نے اہلیہ کے نام لکھا تھا۔ اے جید جوتا پوش! اُس میں تیرا خط نہیں تھا۔ بھائی کیا کاہل ہو گیا ہے میاں؟ سلیم بھائی سے میں نے کہا تھا کہ عمیق حنفی نے بعثتِ نبویؐ پر ایک زبردست epic لکھی ہے۔ وہ منتظر ہیں۔ پوچھتے رہتے ہیں کہ محمود نے حنفی صاحب کی وہ نظم (صلصلۃ الجرس) بھجوائی یا نہیں؟ اطہر بھائی سے ملاقاتیں رہتی ہیں۔ اب وہ زیادہ ہی تنگ دائرے میں گردش کر رہے ہیں۔ دفتر، اصغر بھائی کے گھر، کبھی سلیم احمد کے جمال کے یا میرے گھر۔ اور بس۔

کیا ہم سب لوگ بوڑھے ہو رہے ہیں؟ ہم لوگ خود کو اور زیادہ insecure کیوں محسوس کر رہے ہیں؟ کیا اس لیے کہ ہمارے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ اور وہ دنیا کو face کرنے کو تیار ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک دن جب وہ دنیا کا head on سامنا کر رہے ہوں گے تو انھیں پتا چل جائے گا کہ پاپا ڈیڈی ابو فضول آدمی تھا۔ یہ کوئی ایسی مشکل دنیا تو نہیں ہے۔ پھر وہ ابو اس قدر سہما سہما جھنجھلایا ہوا اور high strung کیوں رہا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ادب ودب نے اسے بے عمل اور خوفزدہ کر دیا ہو۔

یہ سوچنے کا کام بڑا ذلیل کام ہے۔ میری رائے میں بھوت ڈائجسٹ والی اسکیم اچھی ہے۔ اس پر غور کرنا۔

میں پھر چل پڑا ہوں اس لیے خدا حافظ! بھابی کو سلام، بچوں کو پیار، دعائیں۔

تمھارا اسد

12 ستمبر 1985ء

اسد محمد خاں۔سی 14۔شہر بانو پلازا

الیف بی ایریا، کراچی۔38۔

برادرِ عزیز انور خاں!

ہر طرح سلامت اور خوش رہو۔ بے شک اللہ نے اپنے فضل و کرم اور صلاح الدین پرویز کے مالی تعاون سے یہ کائنات بنائی اور زمین کو فرش کی طرح بچھایا اور پھل پھول پودے اور گونگلو پیدا کیے۔اور تمام معدنیات اور خونی اور بادی بواسیریں مہیا فرمائیں۔اور اس نے ڈاکٹر فلاں ابنِ فلاں کو ریٹائر کیا اور پھر اُنھیں پروفیسر ایمیرِطس بنایا اور پھر ریٹائر کیا اور پھر بنایا اور پھر کیا اور اپنے جود و کرم سے اُنھیں وہ جہل عطا کیا کہ ابو جہل کا پتہ پانی ہووے، پھر اُنھیں چار اضافی انکریمنٹ دے کر گرینڈ کیپٹن پر مامور فرمایا تاکہ صاحبِ موصوف اسے بھی اپنے فضلے سے پاٹ دیویں۔اُس کی رحمت کے قربان جائیے کہ اس نے جناب الف کو علم عروض (اور علم لَدُنی) سے نوازا، تاہم عوام الناس پر یہ منکشف نہ ہونے دیا کہ (اُس کی عظیم المرتبت اسکیم اوف تھنگز میں) ہر دو علوم کی غرض و غایت کیا ہے۔

اور اُس نے آٹھ بجے کی لوکل ٹرین ٹھیک وقت پر چلوائی اور اُستاد اختر انصاری اکبر آبادی کو ایک ہوٹل کے کمرے میں ہلاک فرمایا (مگر یہ سب مقامی انتظامات ہیں۔کائنات کے super-duper infra-structure میں ان کے نافذ ہونے یا نافذ نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے کا)۔

غیر کائناتی سطح پر بھی اس نے، اس کی رحمت کے قربان جائیے، کچھ اور ایسے انتظامات کیے کہ بعض باجبروت جرنیلوں کو دولتِ سخن عطا کی اور کمالِ نثر نگاری سے بھی نوازا، ہر چند کہ ان باتوں کا کوئی جواز نہ تھا۔تاہم اُس نے انھیں صاحب دیوان اور صاحبِ تصنیف اس کینڈے کا بنایا کہ اُن کا طرۂ دستار طوطیِ ہند کے طرے سے لگا کھاتا ہے۔اور اُسی نے ایک محترم کے قلبِ گداختہ میں ان سب جرنیلوں کے لیے حد درجے کی محبت پیدا کی اور دوسرے مکرم کو بھی ان کا والہ و شیدا بنایا اور کچھ ایسا اہتمام کیا کہ مذکورہ محترم اور دوسرے مکرم ایک گھاٹ پانی پیتے پکڑے گئے۔اور اُس نے کمر بند کی کچی بعض عورتوں کو مدیرانِ رسائل کے گرد پروانہ وار... (مگر یہ اتہام تراشی ہوگی جو کہا جاتا ہے کہ گناہِ کبیرہ ہے اور میں

گنا ہگار اپنے نامۂ اعمال کو اور سیاہ کرنا افورڈ نہیں کر سکتا)۔

میاں تم جس دنیا میں رہتے ہو اس میں معتدل درجے کی منافقت اور نیم گرم حرام زدگی اور گاہے گاہے کی back biting اور کام چلاؤ قسم کی سازشوں سے گزارا ہو جاتا ہوگا۔ یہاں منافقت، حرام زدگی اور سازش سب اعلا درجے کی ہوتی ہے اور پبلک ریلیشنگ، زناکاری اور دلالی سطحِ اوّل پر کی جا رہی ہے۔ ہمارے یہاں made to order اولیاء اللہ ہیں کہ ان کے تنخواہ دار، کمیشن خوار خلیفوں کا ایک حلقہ ہے جو حضرت صاحب کی کرامات اور خرقِ عادات کی تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت میں ہر وقت منہمک رہتا ہے اور خوب خوب مال بناتا ہے۔ یہ اولیاء اللہ مذہب، ادب، سیاست، فنونِ لطیفہ و کثیفہ کی جملہ شاخوں میں موجود ہیں۔ آپ کے وہاں صلاح الدین پرویز اپنے اعلان ربوبیت کے چھٹے مہینے میں ایکسپوز ہو جاتا ہے اور باقی عمر سنگسار ہوتے ہوئے بسر کرتا ہے۔ یہاں ہر آدمی دوسرے کے سامنے ایکسپوزڈ ہے اور ننگا کھڑا ہے مگر دوسرے کی ستر پوشی کر رہا ہے۔ اور اپنے دل کی طمانیت میں اس بات سے پوری طرح واقف ہے کہ دوسرا اس کی ستر پوشی کر رہا ہوگا، اس کے مفادات اور جینیٹلز کو دھوپ کی تمازت سے بچا رہا ہوگا۔

یہ تمام باتیں، مجی انور خاں! تمھارے کسی خط کے جواب میں نہیں ہیں۔ نہ ہی کسی نے مجھے خصوصیت سے ان دِنوں ستایا ہے۔ یہ دراصل کتھارسس ہے۔ خود میں لوگوں کے ساتھ mild (ہاہ!) درجے کی مُنافقت کرتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ مگر مجھے یقینِ کامل ہے کہ ٹھیک اس وقت کہیں کوئی بیٹھا ہوا میری کمینگیاں یاد کر رہا ہوگا اور اسی طرح زمانے کو برا کہہ رہا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کسی خط میں لکھ رہا ہو۔

مثلاً ابھی ابھی میں ایک خاتون کو ٹیلی فون پر یہ بتا کر آیا ہوں کہ دفتر کی طرف سے سندھ کے صاحبِ حال بزرگ شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ کی یاد میں کل جو جلسہ ہوا تھا اور جس میں وزراء اور علما اور فضلا آئے تھے تو اس کا دعوت نامہ میں نے فلاں کے ہاتھ آپ تک پہنچوایا تھا اور زبانی تاکید کرائی تھی تس پر بھی آپ تشریف نہ لائیں۔ یہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ وہ مجھ سے شکایت نہ کریں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے انھیں دعوت نامہ نہیں بھیجا تھا۔ میں بھول گیا تھا۔ سو میں نے

جارحانہ شکوہ کر کے مسئلہ ختم کر دیا۔ دیکھا آپ نے؟

الف۔ میم۔ سے 12-9-1985

(فیروزہ جعفر سال ہا سال سے لندن میں قیام رکھتی ہیں، کہانیاں لکھتی ہیں۔ اُن کے نصف بہتر علامہ طالب جوہری کے ماموں ہیں۔ عزیزہ فیروزہ نے پروین شاکر سمیت کتنے ہی شاعروں ادیبوں کی میزبانی کی ہے۔ خوردوں میں اتنی شفیق خاتون میں نے کوئی اور نہیں دیکھی۔ عمرش دراز، ضد کر کے اس مہمان کے بھی کپڑے دھو دیے۔ بڑا شرمندہ کیا)۔

Karachi. 21-7-91

بہن فیروزہ! دعائیں۔ 17 جولائی کو ہیتھرو کے لاؤنج سے آپ کو فون کیا تھا۔ 18 کو کراچی پہنچ کر اب کہیں وقت پا سکا ہوں کہ آپ محبت کرنے والوں، میزبانوں، دوستوں، خوردوں کو چند سطریں لکھ سکوں۔ پندرہ ساڑھے پندرہ گھنٹے کی مسلسل فلائٹ کا پہلا تجربہ تھا۔ تین دن زبردست jetlag میں رہا۔

لندن جاتے وقت جمال احسانی کی ہم نشینی تھی تو پتا ہی نہ چل سکا کہ کب کوپن ہیگن اور پھر کب لندن آیا۔ پر لوٹتے وقت صرف حضرت قبلۂ عالم محبی جناب فلاں فلاں نور اللہ تعالیٰ مرقدہ ومشہدۂ کا ساتھ ہوا۔ [حضرت قبلۂ عالم پانچویں قطار میں دو نہایت چھوٹی چھوٹی افریقی طالبات کے ساتھ فروکش تھے، یہ عاصی پانچ قطار پرے دو ملیشیئن لڑکیوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ 'میری والی' لڑکیاں سخت خوفزدہ تھیں۔ جب بھی طیارہ جھٹکے سے ہوا کی آدھی سیڑھی اُترتا تھا، یہ بھیانک آواز میں سسکتی تھیں۔ میں نہایت بزرگانہ طیارہ شناس لہجے میں سمجھاتا تھا: It's nothing ...just a little turbulance۔ لٹل ٹربیولنس کا آئیڈیا sell کرنے میں ناکامی ہوئی تو اُن سے A Tale of Two Cities اور ڈکنز کے بارے میں بات کرنے لگا۔ ایک لڑکی مسلسل ...A Tale پڑھتی آ رہی تھی۔ ادب نے دستگیری کی۔ اُن کا خوف کچھ دور ہوا تو میں نے بتایا کہ میرے ایک co-delegate پانچ قطار پیچھے برابر دُرود وِتاج پڑھ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ طیارے میں کوئی بنیادی خرابی پیدا ہو گئی ہے اور اب بس چل چلاؤ ہے۔ حضرت قبلہ نور اللہ مرقدۂ کو تازیانۂ عبرت کے طور پر استعمال کیا تو لڑکیوں کا کچھ حوصلہ بڑھا۔

انھوں نے ٹربیولینس کے ہنگام خوف کی آوازیں نکالنی بند کردیں۔

یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ میری اپنی بیٹیاں کمرے میں چھوٹے سے کاکروچ کی آمد پر جو فیل مچاتی ہیں وہ اس قبیل کی diversionary tactics سے روکی نہیں جا سکتی۔ مگر یہ دونوں قابو میں آ چکی تھیں۔ (Malaysia اپنے نوجوانوں کی خوب تربیت کر رہا ہے)۔ میں نے سوچ لیا کہ گھر پہنچ کر اپنی دونوں کو بتاؤں گا کہ دیکھو ایک تم ہو۔ ایک (یا دو) وہ لڑکیاں تھیں کہ میرے بھڑے میں آگئیں اور مائیکل جیکسن سے لے کے مسز اکینو کی بیٹی (جو شاید ٹی وی اداکار ہے) اور بی بی سی آئی تک، turbulance کے سوا، ہر موضوع پر بات کرنے لگیں۔ ہوا کا ہیجان ختم ہوا تو میں حضرت قبلہ نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ پی آئی اے کی انتظامیہ پر برہم تھے کہ اُنھیں ناجنسوں کے درمیان سیٹ دی گئی تھی۔ میں نے سوچا اچھا ہوا جو حضرت مشہدِ سخن قبلہ کو میرے برابر سیٹ نہ دی گئی ورنہ میں تمام رستے نثری نظم اور بلیک کومیڈی یا اینٹی اسٹوری پر بک بک کرتا ہوا آتا اور حضرت کا پلاسٹک کے برتنوں میں پلاسٹک چڑھی PIA کی پلاسٹک جیلی تک کھانا حرام کر دیتا۔

روم پر طیارے کا رکنا، نہ رکنے کی طرح تھا کیونکہ ہمیں اُترنے کی اجازت تو رہی ایک طرف، سیٹ چھوڑنے تک کی رخصت نہ ملی۔ بیٹھے رہے اور لمبی لمبی تیل چپڑی دھول بھری جیکٹ زلفوں والے پاکستانی seamen کو بورڈ کرتے دیکھتے رہے۔ یہ ملّاح شاید وہ تھے جو یونانی بحری جہازوں پر ڈیوٹیاں پوری کرنے کی بعد رخصت پر گھر جا رہے تھے۔ کچھ عجب سی دہشت گردوں والی صورتیں تھیں ان کی۔ یعنی ایسا لگ رہا تھا کہ لالوکھیت کے backwoods میں موساد اور خاد اور را اور آر ایس ایس کی مشترکہ کوششوں سے میرے شہر کے چند خوفناک بچوں کو تربیت دے کر سروں میں تیل چپڑ دیا گیا ہے اور فلائٹ پی کے سات سو باسی پر اب روم سے سوار کرایا جا رہا ہے۔ خدا معلوم یہ مانوس شکلوں صورتوں والے ہمیں ہائی جیک کر کے 'کہاں کو' لے جائیں گے۔ مگر یہ تو بڑے docile سلیم الطبع 'دہشت گرد' نکلے۔ سب اپنے سیٹ بیلٹ باندھے، کانوں پر اپنے ٹھسکوپ جیسی ہیئرنگ ایڈ لگائے حاجی فرید حاجی مقبول صابریوں کی دہشت کاری سنتے اور سر دُھنتے رہے۔ ایک بار ہی جو ہاتھ میں بم لے کے بے چارے اپنی سیٹ سے اٹھے ہوں۔ میں ہی گنہ گار اپنے گیلس میں انگوٹھے پھنسائے

سیٹوں کے درمیان ٹہلتا رہا۔

گیلس پر خیال فوراً محبِ گرامی جعفر صاحب کی طرف جا رہا ہے۔ بھائی جعفر ہی نے تو ہم بوڑھے طوطوں کو گیلس پہننا سکھایا ہے۔ بتایئے کہ ان کی مصروفیات اب کس نہج پر چل رہی ہیں؟ فرینکفرٹ تشریف لے گئے یا علامہ صاحب کو لندن ہی سے خدا حافظ کہا؟

بھائی جعفر نے، میاں سلمان نے، اور ظاہر ہے، آپ نے ہم مسافروں کو (جمال تو خیر آپ کا لاڈلا بھائی ہے) جس طرح توجہ اور مہمان نوازی سے سرشار کیا، اُس کی یاد تا عمر رہے گی۔ اگرچہ B.C.C.I. کے مسئلے میں آپ کا پورا گھر اُلجھا ہوا تھا۔ محرم کی آمد آمد ایک الگ مصروفیت تھی مگر جعفر گھرانے کی وضع داری اور غریب غربانوازی (یہ غریب الدیار سے آگے کی ترکیبِ لفظی ہے) بہرصورت ایک روایت تھی جسے نباہنا تھا۔ خدا آپ سب کو خوش و خرم رکھے۔ میں نے لندن میں دوستوں کے ساتھ کمال وقت گزارا ہے اور اس کمال وقت میں آپ تینوں دوستوں یعنی بھائی جعفر کا، آپ کا اور سلمان دوست کا زبردست حصہ ہے۔ دعا گو، اسد محمد خاں۔

ماما بُندیل کھنڈی کے بارے میں۔ (انور سن رائے کو ای میل) 11-8-2004

میرے گیتوں کا مجموعہ پڑھ کے ایک ذہین نوجوان، ناصر کمال نے جو شعر کہتے ہیں، ایک بڑے انگریزی روزنامے سے وابستہ ہیں اور وہیں کالم بھی لکھتے ہیں، میرے عزیز ہیں (ان کا ذکر اس mail کے آخر میں بھی آیا ہے) تو انھوں نے mail بھیج کر اور محبت میں خوش گمان ہو کر کہا، کہ اسد بھائی! آپ شاید پہلے شاعر ہیں جس نے بندیل کھنڈی میں نعتیں لکھی ہیں، (بندیل کھنڈی میری پیدائش کے علاقے وسط ہند کے دیہات کی بولی ہے)۔ میں نے کہا ''ناعزیزم نا! یہ اعزاز مجھ کم خوش نصیب' کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ نا میاں! مجھ سے پہلے بھی کتنے بہت سے بندیل کھنڈیوں نے نعتیں لکھی ہوں گی۔''

نعتوں کے بارے میں میں اب ایک بات کسی عقیدت مندی کے اثر میں نہیں، خوب سوچ سمجھ کر کہتا ہوں کہ رسولؐ کی ذاتِ گرامی، آباد دنیا میں ہر جگہ، کسی لاگ، لالچ کے بغیر سراہی جاتی ہے۔ (Inferno والے حرام الدہر Dante اور اُس مجہول النسب سلمان رُشدی کے سوا) ساری دنیا

میں کتنے ہی لوگ، جو طے شدہ نا مسلم ہیں یا بوجوہ Practising Muslim نہیں سمجھے جاتے، (جیسے کہ کوئی عاجز... جس سے آپ بخوبی واقف ہیں) محمدؐ عربی کو خراج تحسین پیش کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح جیسے آپ اور میں حضرتِ یسوع مسیح اور جنابِ زرتشت اور مہاتما بدھ سے 'اللہ واسطے کا' پیار کرتے ہیں کیونکہ یہ سارے ہی اعلیٰ ترین سطح کے انسان ہیں، آدمی کے محسنوں میں سے ہیں۔

تو نبی کریمؐ کو ہر زمانے میں، ہر جگہ، بے گنتی لوگوں نے اپنی اپنی زبانوں میں یاد کیا اور سراہا ہے، ان کے لیے اپنی محبت ظاہر کی ہے۔

بھائی! یہ ممکن نہیں ہے کہ صاحبِ دل لوگوں سے پورم پور بھرے بُندیل کھنڈ میں، وہاں کی بھولی زبان، سچے محاورے میں رسولؐ کے لیے پیار کے بول اب تک نہ لکھے گئے ہوں۔ نا عزیزم! نا! یہ ممکن نہیں! بہت پہلے ہی، بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے بول لکھ دیے ہوں گے۔

پھر میاں سن رائے! میں اپنی زاد بوم، بُندیل کھنڈ کے بارے میں شروع ہو گیا۔ میں نے لکھا:

بھیا! میں ان لوگوں کا پرانا ہلاک ہوں... بُندیل کھنڈیوں کا۔

بچپن، لڑکپن میں تو گاؤں دیہات میں ان کے ساتھ خوب وقت گزارا ہے۔ میرے مالوے دیس والے گیت کی چندن موسی اور تُلسی اور لچھیا... اور 'یوم کپوز' کا دو جوروؤں والا ٹھاکر اور مٹھو اور اس کا ماما (دونوں آخر الذکر ابھی تک کسی کہانی میں نہیں آئے، مگر آئیں گے ضرور) اور ایسے کتنے ہی جن کے نام میں نہیں جانتا، میری یادوں کے بندی خانے میں براجتے ہیں۔ تم سے کبھی ملواؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ لو اب سنو:

یہ ماما بہت دانش مند آدمی تھا۔ 'مہامائی' کے باغ کی باؤڑی پہ اپنے کچھواڑے کو پانی دے رہا ہوتا اور ڈول کھینچتے بیلوں کو ٹنکارتا تو اس کی آواز سن کر، میں کبھی تو ناشتا چھوڑ کر، بھاگا بھاگا باؤڑی پہ جا پہنچتا اور دیکھتا کہ ماما بھرا ڈول کھینچتے ہوئے اپنے بیلوں کو جگت کے ڈھلوان پر سے اتارے لیے جاتا ہے، یا ڈول خالی کر کے جوڑی کو الٹے قدموں incline پر چلاتا واپس باؤڑی کے جگت کی طرف لا رہا ہے۔

وہ 'اتار' پر جب اپنی جوڑی کو کھینچتا چلتا تو پانی بھرے ڈول کے 'بھار' سے تنے ہوئے رسوں پر بالکل جھک جاتا اور ان پر اپنا 'بوجھا' ڈالتے ہوئے، بیلوں کے ساتھ ساتھ اترنے لگتا۔ پھر جب

اُچھل کر اُن تنے ہوئے رسوں پر بیٹھتا تو (میں آج کی analogy میں کہوں گا کہ) کسی ماہر 'بیلے' رقاص کی طرح foot work کرتا اور رسّوں سے لٹک لٹک کر ڈھلوان پر پھسلتا جاتا۔ گھٹنوں تک کھلی اس کی پتھری پنڈلیاں، مٹی میں سنے اس کے چمرودھے جوتے اور اس کی rythmic 'ہہ ہہا!ہا'... مجھے یہ سب ناچ جیسا لگتا تھا۔

ماما ہنس کے کبھی پوچھ بیٹھتا، ''ای تم کا اا دیکھ رئے او بھیا!؟''

میں کہتا، 'تمھارا ناچ' اور وہ ہنستے ہنستے رسے پہ جھول جاتا۔

یہ ماما، مٹی اور پانی اور بادل اور بجلی اور زمین سے اُگتی ہوئی چیزوں کے اور گردوپیش کے سب احوال جانتا تھا۔ مَیں بھی ان سب چیزوں کے بارے میں اس سے جب چاہتا سوال کرتا اور ماما تُرنت جواب دیتا۔ اس کے پاس ہر چیز کا جواب ہوتا تھا۔

''یہ بادل کہاں سے آتے ہیں؟''

وہ بیلوں کو ہنکانے والی سونٹی سے 'پاترا' ندی کے پتن کو اُلانگھتا ہوا اشارہ کرتا، ''وو دو ٹلے پار سے۔''

''مٹی میں کیا ہوتا ہے جو بیج سے پیڑ بن جاتا ہے؟''

وہ جیسے گا کے کہتا، ''یا ماٹی ماں تو سبئی لیلا اُپرم پار کو ہے بھیا!''... کیا پتا کسی بھجن کی لائن سُناتا ہو۔ ('کو'۔ بندیلی میں 'کی' ہوتا ہے)

''یہ جو باؤڑی میں سیڑھیاں اتر رہی ہیں یہ کہاں تک ہیں؟''

ماما فیصلہ کن جواب دیتا، ''جھان تولے باؤڑی، بھان تولے سِڈھی'' (جہاں تک باؤڑی ہے وہیں تک سیڑھی ہے)۔

برادرم انور سن رائے!

میں شکرگزار ہوں اپنے دادا اور باپ کا جنھوں نے میرے شعور کی عمر میں کئی کاریوں کو، میرے سامنے ہوتے، برابر کا پروٹوکول دیا (ہمارے تمھارے دیس میں تو بعض جگہ انھیں کمی کمین کہا جاتا ہے۔ جسے سن کر ہم تم اور ہمارے بہت سے دوست بہت اداس اور برہم ہو جاتے ہیں)۔ وہ 'اونچیر

گاؤں' کے ہمسایہ کسان اور کھیت مزدور تھے جو کبھی دادا کے مزارعے ہوتے تھے۔ دادا کے بعد بھی وہ برابر ہم سے ملنے آیا کرتے اور جنگل کی اور اپنے کھیتوں کی سوغاتیں لاتے تھے۔ ابا کے آگے کرسیوں پر بیٹھ کے وہ میرے دادا کو اور اپنے بچھڑے ہوؤں کو یاد کر کے روتے اور تسلی کے دو بول سن کے چلے جایا کرتے تھے۔ کتنی نسلیں گزر گئیں۔

نہ اُن کے بچوں، نیک بختوں کو کوئی بتانے والا رہا کہ اس پھیلتے ہوئے شہر کے اس بے شکل وصورت مکان میں ایک 'بڑے میاں صاب' رہا کرتے تھے جو اپنی جاگیر (بعد میں متاجری) کے گاؤں 'اونچیر' کے دیہاتیوں کو برابر کا انسان جانتے تھے۔

نہ وہاں کے بچوں اور ان کے بچوں سے کوئی کہنے والا رہا کہ یہ جو سامنے بیل گاڑی ہنکاتا، اپنے بیلوں کو ٹٹکارتا گاؤں والا جا رہا ہے، ہو سکتا ہے یہ 'اونچیر گاؤں' کا ہو اور اس کے بڑے بوڑھوں کو تمھارے بڑوں سے کبھی بہت 'اللہ واسطے کا' پیار ملا ہو۔

ابھی ایک سوال ذہن میں آیا ہے — بہت عامیانہ سا: کہ کیا معاملات اب 'اللہ واسطے' نہیں ہوتے؟ اور کیا ہر معاملے میں کوئی لاگ لالچ موجود ہے؟ ثواب کا لالچ؟ اور good will کی چنتا؟ اور ووٹ اور پیسے حاصل ہونے کی امید؟ اور کیا لوگ اچھی اچھی باتیں کر کے یا کچھ دے دلا کے لوگوں سے کام نکال کے چلتے نہیں بنتے؟ کیا وہ پٹاتے seduce نہیں کرتے؟ اور کیا جنھیں بندوں سے بے تعلق اور بے نیاز یا خود غرض اور حرام الدہر کہا جاتا ہے وہ ابھی کے، اسی نئے millenium کی پیداوار ہیں؟ کسی اور زمانے میں ایسے لوگ نہیں ہوتے تھے؟ (ہوتے ہوں گے۔ بلکہ اب یاد آیا کہ ...ہوتے تھے۔ بے شمار تھے۔ لیکن I don't care to recall them۔ کیسا؟) اور کیا میری یادوں میں جو goody goody باتیں اور بیبے بیبے لوگ ہیں وہ ختم ہو گئے اور اب ویسے بالکل نہیں ہوتے؟

ہوں گے — بہت ہیں!

But I have no patience (& time) left to dig them out. Let younger persons do it.

مجھے تو اپنی یادوں کی بازیافت میں مزہ آ رہا ہے۔

یارا... انور سین رائے!

دوروز سے اس کہانی ''مہامائی کا ماما'' پر کام کر رہا تھا۔ نیت تھی کہ پوری ہو جائے گی تو پڑھنے کو تمھیں بھیجوں گا۔

ابھی صبح ہی صبح جب تم نے اپنے گھر لندن سے فون کیا تو اسد بھائی نہال ہو گیا اور نامکمل (ہی سہی) اس نے یہ کہانی تمھیں اور عذرا کو بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ او میاں جب یہ پوری ہو گی تب بھی پڑھ ہی لو گے۔

اسے اب تک خود میں نے، میرے اُس عزیز، میاں ناصر کمال نے (جو بیک وقت میرا کزن بھی ہے اور بھتیجا بھی) پڑھا ہے۔ اب تم پڑھ رہے ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ دو چار دن میں یہ پوری ہو جائے گی۔

بات جو پھیل گئی ہے... وہ جو میرا بائی قدس سرِ العزیز نے کہا ہے کہ ''اب تو بات پھیل گئی...'' وغیرہ وغیرہ۔

دعائیں، اسد بھائی۔ 11-8-2004

(اپنے بھتیجے/ بھائی ناصر کمال کو ایک ای میل)

ناصر میاں!

اُس ای میل میں جہاں یوسفی صاحب کا اور ضمیر نیازی صاحب مرحوم کا اور میری نظم ''مناجات'' کا ذکر چل رہا تھا۔ میں نے جم کے لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ آسمانی سلطانی ہوئی، بجلی چلی گئی اور mail اریز ہو گئی۔ میں نے بے مزہ ہو کے، مختصر وضاحت سی لکھ کر قصہ ختم کر دیا۔ لیکن آدمی ضدی ہوں (اپنی لکھت کے حوالے سے) جب تک اس طرح بیان نہ کر لوں جیسے بیان کرنا چاہتا تھا، مجھے چین نہیں آتا۔ تو میاں اب سنو:

مگر پہلے کچھ ان محاوروں کے بارے میں جو نظم ''مناجات'' میں آئے ہیں:

بکرا بلانا... Ululating... صحیح کہا آپ نے۔

''بڑھک مارنا'' یہ لاف زنی کے معنوں میں ہے۔ ہماری پنجابی فلموں میں جب تک 30 یا 40

بڑھکیں نہ ہوں ایک عام viewer کو مزہ نہیں آتا۔ ہیرو یا ولین اردو کے 8 کی طرح ٹانگیں کھول کے سینہ پھلا کے دونوں بازوؤں کو غوطہ مارتے پرندے کے پروں کی طرح stiff کر کے بکنا شروع کرتا ہے اور دیر تک بکے جاتا ہے کہ میں "اینج کر دیاں گا، اونج کر دیاں گا" کرتا کراتا کچھ نہیں۔ یہ badhak! ہوتی ہے۔

ایک بھوپالی expression ہے: لُولُو بولنا (Lu Lu Bolna) تو ایک دور دراز امکان ہے۔ wild thinking۔ یہ لُولُو کہیں Ulualting کا بگاڑ تو نہیں ہے؟ on second thought. یا یہ اپنی دِلّی کے محاورے میں۔ "لُولُو ہے بے لُولُو!" تو نہیں ہے؟

"لال قلعے کی ایک جھلک" خواجہ حسن نظامی (علیہ الرحمتہ) کا ایک مضمون یا کتابچہ ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ جب قلعہ معلّی کے آگے سے ایک گورا صاحب گزر رہا تھا تو رہائش گاہِ سلطانی سے نظر ڈالتے ایک شہزادے نے نفرت سے پکار کے کہا تھا کہ "لُولُو ہے بے لُولُو" گورا صاحب سمجھ گیا۔ اس نے رولا ڈال دیا۔ پکڑو پکڑو ہونے لگی تو ایک وابستۂ دولت نے سمجھایا کہ حضور! لُولُو فارسی میں موتی کو کہتے ہیں۔ شہزادہ تو صاحب کے حُسنِ جہاں سوز (my words) کی تعریف کرتا ہے۔ ہاہاہا Wild thinking continues مثلاً اِن دنوں اسلام آباد سے گزرتے ہوئے اپنے چچا، میاں عنایت محمد خاں صاحب، کونڈولیزا چاول کو دیکھ کر مجھ سے کہیں، "دیکھنا خاں چاول بائی جا رہی ہے۔" ہوسکتا ہے وہ اسے بریانی کہہ کر وضاحت کریں کہ اپنی طرف اس نام کی ایک بیٹرنی رہتی تھی۔ ha ha! ان کی جھلسن کی وجہ، ظاہر ہے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔

خیر، dot dot برسیاہ رویانِ جہاں! یہ 'سیاہ رویاں' ہرگز ہرگز colour of the skin نہیں ہے۔ آپ کو تو پتا ہے black is beautiful۔

اب یوسُفی صاحب کے بارے میں:

عصمت کی نوکری کے سلسلے میں جو کچھ کیا وہ یوسُفی صاحب نے اس سے دس منٹ بات کر کے اور مجھ سے پوچھ کے کہ 'کیا یہ تمھارا حقیقی بھائی ہے؟' کر دیا تھا۔ بعد میں جب بھی میں نے یہ ذکر چھیڑا، انھوں نے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ "بھئی خاں صاحب! بینک نے مجھے پابند کیا تھا کہ میں

نئے افسر بھرتی کروں، صاحب زادے اچھے موقعے سے آ گئے، میں نے رکھ لیا۔''

..سبحان اللہ! کیا وضع داریاں ہیں!

میاں عصمت نے بھی انھیں مایوس نہیں کیا۔ 16/15 برسوں میں وہ senior manager بن چکا تھا۔ اور ایک عجیب بات ہوئی تھی... اس کے انتقال کے پچاسویں دن بینکرز اکادمی کا ایک خط گھومتا گھامتا میرے پتے پر آیا تھا کہ ''مسٹر آئی ایم کے نے AVP کے لیے کوالیفائی کرنے والا امتحان پاس کر لیا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ انھیں اگلے چند برسوں میں (other things remaining the same) اے وی پی پروموٹ کیا جا سکے گا۔''

تو اب یوں ہے کہ صاحبو! اللہ ہی اللہ ہے۔ Man proposes, the Oldman disposes.

اس لیے برادرم! میں، مشتاق احمد یوسفی صاحب سے ان کے لٹریری کام کی وجہ سے بھی محبت کرتا رہوں گا اور ان کی بھلمنسی اور احسان کو بھی tribute پیش کرتا رہوں گا۔

پچھلے دنوں کسی خبیث حاسد نے ایک گمنام مراسلہ لوگوں کو ڈاک سے بھیجا تھا جس میں میرے ان دو دوستوں، افتخار عارف اور یوسفی پر درجنوں بہتان لگائے گئے تھے اور حرامزدگی کی باتیں کی گئی تھیں۔ میں، اور سبھی احباب، بہت بے کیف ہوئے تھے۔ میں کیا کرتا — نوجوان دوستوں کے سمجھائے پر ہوا میں گالیاں بک کر چپ ہو رہا (پنجابی میں گالیاں بکنا نہیں نکالنا کہا جاتا ہے۔ شاید کیتھارسس کے حوالے سے کہتے ہوں گے)۔

کل آپ کا بے پناہ اہم میسیج ملا۔ وہ جو آپ نے ''مہامائی'' کے باغ کی حالیہ وزٹ کے بعد بھیجا ہے۔ جیتے رہیے، خوش رہیے۔

سوچتا ہوں آپ کے اس narration کو بالکل اسی طرح، ترجمہ کر کے، اس بنت کا حصہ بنا دوں۔ دیکھیے اللہ مالک ہے۔ مگر کیا بربادی، کیسا desolation ہے!

اس کے بارے میں پھر کبھی لکھوں گا۔ اس وقت بہت تھک گیا ہوں۔

میرے حساب سے دو صفحے پورے ہو گئے۔ خدا حافظ! بامانِ خدا! فی امان اللہ! وغیرہ۔

اسد بھائی۔ 9 ستمبر، دو ہزار چار۔

(اپنے بھتیجے/ بھائی ناصر کمال کو ایک اور ای میل) Karachi. 9-9-2004

ناصر میاں!

زندہ وسلامت باش۔ بھائی، بہت کمال کا کالم لکھا ہے آپ نے۔ میری طرف سے بے حساب داد اور بھرپور حمایت شاملِ حال سمجھی جائے۔ میں نے صبح کی mail میں لکھا تھا کہ آپ کی تحریر نے ــــ وہ کیا کہتے ہیں؟ ــــ نہ صرف move کیا ہے، بلکہ ہلا کے رکھ دیا ہے۔ ماشاءاللہ۔

گنتی کے لفظوں میں زندہ لکھت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میں کالمسٹ کی مشکلوں کو سمجھتا ہوں۔ تاہم، کچھ کر کے، اپنے ریڈرز کو بتا دیجیے کہ جس نالے کے culvert کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سارا سال بہنے والی پاترا ندی تھی جس پر چھوٹے خاں (Ref. History of Bhopal State) نے بند باندھ کے ایک آبشار بنایا تھا اور پاترا ندی کو 'مہامائی' کے اس رُخ سے نکالا تھا جو ریلوے اسٹیشن کو face کرتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ باغ سے ماڈل ہائی اسکول کے لیے نکلنے کو ہمیں ٹھنڈی سڑک Starting from "Narbada Ice Factory" پر آنے کے لیے 'چیل' کے ایک تناور درخت کے 'ڈالے' کو (جو پاترا ندی پر کسی پُل کی طرح جھکا ہوا تھا) straddle کرتے ہوئے ایک ایک چپّا (چپّا چپّا چرخہ چلے) سرکنا پڑتا تھا۔ پاترا کے اس پتّن ('pattan' in Punjabi means Saahil) اُس پرلے کنارے پر ڈالے سے چھلانگ لگا کر آئس کریم فیکٹری کی طرف دیوانہ وار دوڑنے کی مسرت کو میں ابھی بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اُسے ناول کے ایک باب کے لیے بچا رکھا ہے۔

عزیزم! اس کرتب کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ آٹھ سے گیارہ بارہ برس کے eloquent بچوں سے ــــ جو ماشاءاللہ گھر ہی میں ہیں ــــ پوچھ لیجیے۔

میں نے 1980ء کی ایک کہانی ''گھر'' میں (جسے قاسمی صاحب نے بہت پیار سے رسالہ ''فنون'' میں چھاپا تھا) پاترا ندی کو بیان کیا ہے:

''...میں ایک دفعہ کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا۔ میں باہر کس لیے نکلوں؟ میرے گھر میں، گھر کے گرداگرد بڑی دل موہ لینے والی چیزیں ہیں۔ گھر کے پچھواڑے کی باڑ سے ملے ہوئے

بانسوں اور سرکنڈوں کے چھدرے چھدرے جھنڈ ہیں جن سے بچتی بچاتی پاترا ندی بہتی ہے۔ نقشہ نویسوں نے اسے کوئی نمبر دے رکھا ہے۔ وہ اسے نالہ بارانی شمالاً جنوباً نمبری فلاں فلاں کہتے ہیں اور اپنی بے خبری میں اسے بہت مسکین جانتے ہیں۔ مگر چار پانچ دن لگا تار ایک ہی رفتار سے ننھی ننھی سوئیوں جیسی پھوار بھی پڑتی رہے تو یہ پاترا ندی اپنی بانہیں اور جانگھیں پھیلا دیتی ہے اور آس پاس کے سب کھیتوں کو اپنی خواہش کا نشانہ بناتی ہے اور انھیں اپنی کاہل، تیل چپڑی، آہستہ رو شہوت میں لتھیڑ دیتی ہے اور مجھے بڑی شرم آتی ہے جب میں اس کی بغلوں سے اور پیڑو سے جھانکتے ہوئے سرکنڈوں اور بانسوں کے گیلے جھنڈ دیکھتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنے کسی محرم کو، جس سے کوئی جنسی ربط ممکن نہ ہو، کھلے ستر دیکھ لیا ہو۔ تب میں ــــ جو اس کا وَستر، اس کا ستر پوش ہوں ــــ میں اپنی پلکیں گرا کر اس کی ستر پوشی کرنا چاہتا ہوں، اسے محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔ پر ساون بھادوں میں جہاں تک نظر ڈالو یہ بھاری اُستنوں والی اَبلا، کالی مٹی پر اپنی کایا کا بوجھ ڈالے، آلس کے ساتھ کروٹ بدلتی دکھائی دیتی ہے اور بڑی غیر محفوظ لگتی ہے اور میں سوچتا ہوں اسے کون سمیٹ سکتا ہے۔ کہاں تک سمیٹ سکتا ہے۔

ننھی سوئیوں جیسی پھوہار، کہر کی دبیز چادر کی طرح دوسرے کنارے کے جانے پہچانے نشانوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور ندی کا پاٹ کئی میل کا دکھائی پڑتا ہے۔ گہری دھند میں ندی کے پار سے آوازیں کچھ اس طرح آتی ہیں جیسے یگوں کے پار سے آ رہی ہوں۔ تب ایسے میں، میں ندی میں اتر جاتا ہوں اور کندھوں تک پانی میں ڈوبا ہوا ان آوازوں میں لپٹی ہوئی ایک خاص آواز کو ڈھونڈتا ہوں جو پکار کر کہتی ہے کہ ہے پاترا! ہے پتریا! ہے ویشیا! ہے کلنکنی! پھر یہی آواز ہچکیاں لے لے کر روتی بھی ہے۔ پتا نہیں کون بوڑھا بدمعاش ہے جو ننھی ننھی سوئیوں کی ٹھنڈی دھند کے پار کھڑا ہوا ندی کو برے برے نام دے رہا ہے۔ میں کسی روز اسے گدی سے پکڑ کے اس کا منھ کیچڑ میں دے دوں گا۔

ایک روز میں نے چیخ کر کہا بھی تھا کہ او بڈھے سُور! بکواس بند کر! اور مارے غصے کے پانی میں کھڑے کھڑے میرا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ یہ ایسی پریشانی کی بات تھی کہ میں ندی سے نکل کر سیدھا اپنے گھر بھاگ آیا اور بہت دنوں تک پانی کے پاس نہیں گیا۔ بس گھر میں بیٹھا رہا اور برگد کی

چار ماترائیں سنتار ہا کہ تاااانا نا ناحووو...''

برادرم! .

یہ برگد کا آوازہ وغیرہ، صوفیہ کے آوازے ''تانا نا ناھو'' کے مماثل ہے اور کہانی کی ابتدا سے جاری موسیقی کی terminology میں ایک refrain کی طرح ہے جو اس کہانی کو اپنے logical windup کی طرف لے جاتا ہے۔ پاترا ندی اس کہانی میں کم و بیش اتنی ہی ہے۔

اب میں چلتا ہوں۔ سہ پہر کے ساڑھے چار بجے ہیں۔ سوتا ہوں۔

دعائیں۔ اسد بھائی۔

پس نوشت:

ناصر میاں!

میں اس ناول/ ناولٹ کو بہر حال 'مہامائی کے باغ' سے آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے پاترا ندی کے معدوم ہونے کو جس دکھ سے بیان کیا ہے وہ بہت متاثر کن ہے۔ آپ اپنے شہر سے — جی نہیں، بلکہ زمین سے، زمین کی ہریاول سے، بہتے پانی سے اور نمو سے پیار کرتے ہیں۔ بے شک پیار کرتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں — مگر کمال کی بات ہے یہ۔

میرا یہ ہے کہ میں اپنی زندہ ندی کو سن پینتالیس میں پہنچ کر آسانی سے 'ری کری ایٹ' کرا لوں گا۔ اس لیے کہ میرے پاس تو وہی پرانے نقش ہیں دھندلے...اور خوبصورت۔ پھر وہ مرحلہ درپیش ہوگا کہ جب اس 'ناموجود' کو — ناموجود صرف میرے لیے — اُس ناموجود پاترا ندی کو گاڑھے کیچڑ میں بدلتے یا زخم سے رستے ست رو puss کی لکیر میں بدلتے دکھانا ہوگا تو پھر کوئی اور جتن کروں گا۔

بھائی! میں کچھ تو جان گیا ہوں کہ چیزوں پر موت کا اور decay کا ورود کس طرح ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اور بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ لو، اب دیکھو پاترا ندی اور مہامائی پر تم سے جو سوال جواب ہو رہے تھے، ان کی تخلیقی شکل اس طرح بنی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کہانی سے متبدل ہو کر یہ ناول کا باب کیسے ہو گیا۔ پڑھو:

اسد بھائی

(اسد محمد خاں کے آنے والے ناول کا ایک باب)

کسی برکتوں والی اُمید کے ساتھ خانوں میاں نے ہلکی آوازوں والے ایک شہر میں، سارے سال بہتی ایک ندی سے کوئی میل بھر دور ایک ایسے مکان میں آنکھ کھولی تھی جسے ڈیڑھ دو سو برس پہلے، بے سوچے سمجھے، بہت سی جگہ میں، بہت سی اینٹوں پتھروں سے بنالیا گیا ہوگا۔

مکان ایسا بُرا نہیں تھا۔

شہر کے باہر ندی کے دوسری طرف ایک باغ تھا۔ باغ میں ایک مسجد، ایک باؤڑی، بہت سی پرانی قبریں اور دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنی چھ آٹھ کمروں کی ایک عمارت تھی جو 'میاں کی باکھل' کہلاتی تھی۔ باکھل کی چھت کویلو کی تھی۔ ساون بھادوں میں ٹوٹ کے برستی برساتیں چھت کو کائی جما کے ہرا کر دیتی تھیں اور گرمیوں کی دھوپ اس ہرے کو سیاہ بنا دیتی۔ سردیوں میں یہ چھت مٹ میلی دکھائی دیتی اور دیکھنے والوں میں سے بہت سوں کو اُداسی میں ڈال دیتی تھی۔

خانوں کو یہ باغ اچھا لگتا تھا۔

باکھل والے میاں لوگ، خانوں کے بہت قریبی عزیز ہوں گے، اسی لیے خانوں کے گھر والے سال میں ایک دو بار یہاں آ آ کے رہتے اور خود کو زمین سے اگتی ان چیزوں کے قریب پاکر خوش ہوتے تھے کہ جن کے رنگ سبز اور نیلے اور سیاہ اور سرخ اور زرد اور نارنجی اور کئی طرح کے ہوا کرتے تھے۔

اُگنے والی ان چیزوں کے رنگ بعد کو خانوں میاں کے لیے آہستہ آہستہ مٹ میلے ہوتے گئے اور دھندلا گئے — مگر ایسا برسوں بعد ہوا تھا۔ اور وہ ایک الگ کہانی ہے۔

خانوں میاں دس برس کا تھا تو اس نے جھاڑیوں کے بیچ چھپا کر بنایا ہوا ایک دیوی استھان دیکھا تھا۔ سو پچاس برس پہلے کسی نے پیپل کے چھتنار کے تنے سے، ایک بے شکل سا دو ہاتھ اونچا پتھر ٹکا کر اُس پر گیرو مل دیا تھا، آس پاس پھول بکھرا دیے تھے۔ جھاڑیوں نے دیوی استھان کے گرداگرد اُگ کر اسے ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا جنھیں اس دیوی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ہاں پوجا پاٹھ والے آتے، جھاڑیاں ہٹا کے اپنی آرادھنا کرتے، کچھ دیر ٹھیرتے اور چلے جاتے۔

کچھواڑے میں کام کرنے والے کاچھی ہری لال نے خانوں کو بتایا تھا کہ یہ دیوی مہامائی کا استھان ہے۔

خانوں نے کہا تھا، اچھا!

پھر اُس نے خود سے کہا تھا، ہاں جبھی تو اس باغ کو مہامائی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

ہری لال کاچھی نے، جسے سب ہریا کہہ کے بلاتے تھے، خانوں کو مہامائی کی اور بھی باتیں بتائی ہوں گی مگر اسے اب کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

ہریا سولہ اٹھارہ برس کا ہوگا پر اس وقت بھی بہت سی باتیں اُسے دوسروں سے زیادہ معلوم تھیں۔

بہت دانش منداور گُھنا تھا یہ ہریا۔

وہ مہامائی کے باغ کی باؤڑی سے کچھواڑے کو پانی دے رہا ہوتا اور ڈول کھینچتے بیلوں کو ہنکارتا تو اس کی آواز سن کر خانوں میاں، ناشتا چھوڑ، بھاگا بھاگا باؤڑی پہ جا پہنچتا اور دیکھتا کہ ہریا پانی سے چھلکتا، پوروں پور بھرا ڈول کھینچتے ہوے زور لگاتے بیلوں کو جگت کے ڈھلوان پر سے ایسے اتار رہا ہے جیسے سرکس کا تماشا دکھاتا ہو۔ یا پھر وہ ڈول خالی کر کے سیدھے سجاؤ اپنی جوڑی کو الٹے قدموں ڈھلوان پہ چڑھاتا، بیلوں سے باتیں کرتا، واپس باؤڑی کے جگت کی طرف لا رہا ہوتا۔ یہ محنتی کی کاری، ہریا... ہری لال کاچھی۔

وہ جب 'اُتار' پہ چلتا تو پانی بھرے ڈول کے بھار سے تنے ہوے رسوں پہ جھک جاتا اور اُن پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوے، بیلوں کے ساتھ ہولے ہولے ''اُترنے'' لگتا... اور جب اُچھل کر تنے ہوے رسوں پر بیٹھتا تو ماہر نرتیہ کار کی طرح قدم لیتا یا رسوں سے لٹک لٹک کے ڈھلوان پر پھسلتا۔ گھٹنوں تک کھلی اس کی پتھر جیسی پنڈلیاں، کیچڑ مٹی میں سنے اُس کے چرودھے جوتے اور تال کے ساتھ چلتی اس کی ''ہہ ہہا! ہاہ!'' خانوں میاں کو یہ سب ناچ جیسا لگتا تھا۔

ہریا ہنس کے کبھی پوچھ بیٹھتا: ''ای تم کاا دیکھ رئے او بھیا؟ بیری بیری آئے کے کاا دیکھے ہےاو؟''

خانوں کہتا: ''تمھارا ناچ دیکھتا ہوں''— اور ہریا ہنستے ہنستے رسے پہ جھول جاتا۔

یہ ہریا، مٹی اور پانی اور بادل اور بجلی اور زمین سے اُگتی ہوئی چیزوں کے اور ان کے آس پاس کے سب احوال جانتا تھا۔ خانوں ان سب چیزوں کے بارے میں جب چاہتا اس سے سوال کرتا اور ہریا سے ترنت جواب پاتا۔ لگتا تھا اس سیانے کے پاس ہر بات کا جواب ہے:

''یہ بادل کہاں سے آتے ہیں؟''

وہاں میں سر ہلاتا یعنی ٹھیرو، بتاتا ہوں۔ پھر بیلوں کو ہنکانے والی سونٹی سے وہ 'پاترا' ندی کے چتن کو اُلانگتا ہوا اشارہ کرتا کہ ''وووو پلے پار سے۔''

''مٹی میں کیا ہوتا ہے جو بیجے سے پیڑ بن جاتا ہے؟''

ہریا جیسے گا کے کہتا، ''جا ماٹی ماں تو سبری لیلا، ہبرا کھیل تماسا ایکئی ان حد، ایکئی اَپرم پار کو ہے۔'' کیا خبر کبھی کے سنے ہوئے کسی بھجن کے بول پڑھ دیا کرتا تھا وہ... یا کچھ بھی۔

خانوں اس سے پوچھتا، ''ہری لال! باؤڑی میں جو سیڑھیاں ہیں یہ کہاں تک گئی ہیں؟''

ہریا بُدھی مانوں کی طرح سر ہلا کے کہتا، ''ہا آں ں۔ جھان تو لے باؤڑی رے بھیا! بھان تو لے ای سِڈھی ہوئے گی۔ اوور نہیں تو؟''

جاڑوں میں ڈول سے اُلٹتے اور برہوں میں بہتے پانی سے بھاپ اُٹھتی اور خانوں حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ انہونی ہوتے دیکھتا، تو ہریا کسی گھمنڈی چمتکاری کی طرح ہنستے ہوئے گردن اکڑا کے خانوں پہ نظر ڈالتا۔ مانو ہریا ہی باؤڑی کے پانی سے بھاپیں اُٹھاتا ہے اور خانوں کو حیرتوں میں ڈالتا ہے۔ یہ رُتوں موسموں کا پالنہار، جل داتا!— یہ ہریا— ہری لال کاچھی! کچھواڑوں کا سیوک! خانہ آباد!

''اے خانہ آباد! ہریا! خوش بختا!'' وِلایتن بوا کی آواز آتی، ''اُسے باتوں میں نہیں لگا اوئے! ابی ناشتا بی نہیں کیا اس نے۔ بھجے جو، ادر بھجے جو اُسے... خانہ آباد کو۔''

ہریا آنکھیں نکال کے دبی آواز میں خانوں سے جانے کو کہتا کہ جاؤ رے بھیا، بوا اماں غُصہ کری ہے۔ تو مجبوراً خانوں، ہری ہری آنکھوں، مہندی رنگے بالوں اور لال بھبھوکا گالوں والی وِلایتن بوا کے پاس... اور ناشتے کے پاس لوٹ آتا۔

مگر اسے بیلوں کو ہنکارتی ہریا ہری لال کی آواز برابر آتی رہتی۔ وہ خوب سمجھ رہا ہوتا کہ ڈول سے اترتا، لشکارے مارتا پانی، بہت ہی بھاپیں اُٹھاتا، برہوں میں بہتا، کھواڑوں میں پہنچ کے مٹیوں کوتر بتر کرتا جارہا ہے۔

وہ پہلے سے جانتا تھا کہ ہریا کی ہنکارتی آواز تمام سبز اور نیلی اور سیاہ اور سرخ اور زرد اور نارنجی چیزوں کو اُگنے پہ اکسارہی ہے، اکساتی رہے گی۔

ٹھیک تو ہے:

(یہ سب کچھ ویسا ہی تو ہورہا ہے۔ کچھ اوپر ستر برس کے خانوں نے دل میں دُہرایا) ویسا ہی تو ہورہا ہے جیسا کہ توریت کے باب اوّل 'کتاب پیدائش'' میں درج ہے...کہ یہوواخداوند نے پہلے زمین اور آسمان بنائے تھے۔ اور زمین پر (جوابھی برومند نہ ہوئی تھی) نہ تو وحشی جھاڑیاں ہی تھیں، اور نہ کسی خودرو پودے نے ابھی سر اٹھایا تھا، کیونکہ 'یہووا' نے (تاحال) زمین پر بارش نہیں بھیجی تھی اور نہ زمین پر اُسے جوتنے والا آدمی (یہ ہریا؟) آیا تھا۔ (تاہم) زمین سے ایک سَیل (ضرور) اُٹھ رہا تھا جو مٹی کوتر کرتا جاتا تھا۔

ہنے ہنے—! گویا یہ زمیں آدمی سے آباد نہ ہوئی تھی؟— نصیبوں والی۔

تبھی 'یہووا' نے دھول کو پانی میں گوندھ کر اس آدمی (ہریا؟) کا پتلا بنایا اور 'یہووا' خداوند نے اس کے نتھنوں میں اپنا نفسِ (زندہ) پھونک دیا، اور یہ سانس لینے لگا۔

''اے سبحان اللہ!''— اور اب دیکھو! یہ خانہ آباد، پانی بھرا ڈول کھینچتے ہوئے کیسے ہولے ہولے بیلوں کی جوڑی کے ساتھ باؤڑی کی ڈھلان پر سے اُتر رہا ہے۔ یہ آدمی، ہریا ہری لال۔ اور چیزوں کو اُپجاتی، انھیں برومند کرتی، ان میں اُنگر لاتی زمین کیسی چل پڑی ہے۔ کے ے ے...ی۔ اے سبحان اللہ!

چنانچہ، کچھ اوپر ستر برس کا خانوں اپنے دل کی مسرت میں کروٹ لے کر آسائش سے اونگھنے لگا۔

❦❦❦

'آیا درازا، آیاہ بالا' اور 2008ء

اے بھائی مبین مرزا! زادلطفہ

کچھ ڈھب یا (format) سا بنتا جارہا ہے کہ "ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی" کو تمھارے نام لکھے گئے خط کی طرح شروع کرتا ہوں اور اس خط میں دنیا جہان کی باتیں لکھتا چلا جاتا ہوں: اپنے سفروں کے احوال، کسی کتاب، کسی دوست کا ذکرِ خیر۔ یا کچھ ایسا کہ اُس پر essay کا گمان ہونے لگے۔ یا کوئی کہانی جو اپنے سنائے جانے پر اصرار کرتی ہو۔ کسی ممدوح، کسی بڑے کہانی کار کا ترجمہ۔ اپنی — یا کسی کی بھی — کوئی نظم، گیت — کچھ بھی۔

گویا بے شمار امکانات سے بھری ہوتی ہے یہ "ٹکڑوں میں کہی گئی —" آغاز میں مجھے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ اِس 'کہانی' کے مندرجات کیا ہوں گے۔ اِس بار، البتہ کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ 1991ء کے اپنے سفرِ انگلستان اور کیرن آرمسٹرانگ کی معرکہ آرا تصنیف "A History of God" کے ذکر اذکار تو شاید اس مرتبہ ہوں گے ہی۔

Karen Armstrong کو دوسری بار (مزے لے لے کر) پڑھتے ہوئے مجھے ایک اور بھی مصروفیت لاحق تھی۔ وہ یہ کہ اپنی کہانیوں کو یک جا چھپوانے کا منصوبہ آخری مراحل میں تھا اور میں پروف پڑھ رہا تھا۔ پروف پڑھتے ہوئے میں اپنی کہانی "براوو براوو" پر آیا تو خیال ہوا کہ سنہ ۷۸/۷۹ء میں لکھی گئی

اس کہانی کا موضوع بہت کُڈھب ہے اور مجھے بہت عزیز بھی ہے — کیوں نہ کہانی پر نظرِ ثانی کر لی جائے۔ نظرِ ثانی کیا کی کہ کتنے ہی در کھلتے چلے گئے:

اٹھارہ بیس دن کی اس revision مصروفیت کو میں نے طویل چھٹیوں کی طرح گزارا۔

سنہ ۱۹۸۲ء کی مطبوعہ اپنی کتاب ''کھڑکی بھر آسمان'' میں، میں نے نظمیں اور کہانیاں یک جا کی تھیں، کس لیے کہ بعض کہانیوں کے سلسلے میں بڑی دل چسپ صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی... یعنی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ قطعاً کہانی ہے اور طویل نظم 'نہیں' ہے۔ بعض کہانیاں کسی ہائی برو تمثیل کا scenario لگتی تھیں، مثلاً کہانی ''براوو براوو'' میں کچھ یہی بات تھی کہ بیانیے کی سیڑھیاں چڑھتی اترتی، یہ کسی سینیریو کی طرح unfold ہوتی چلی جاتی تھی۔

اے میاں مبین! تمھیں علم ہے کہ کہانی کا protagonist کسی Absolute کی تلاش (بلکہ وجودِ مطلق کی دیوانہ وار جستجو) کو اس حد تک خود پر مسلط کر چکا ہے کہ اُس کا کردار اس تلاش سے الگ کر کے سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

مرکزی کردار کا ذہنی/روحانی پس منظر میں نے واشگاف الفاظ میں نہ بتاتے ہوئے علامتوں اور اشاروں میں اور کہانی کی بُنت، میں اُس کے ٹائم zones میں اس طرح پھیلا دیا تھا کہ توجہ سے پڑھنے والا جان سکے کہ اس کردار کی تربیت اردو زبان کی پان سات سو سالہ شعری ادبی روایت میں ہوئی ہے اور یہ کہ ارسطو سے دو سو برس پہلے کے بعض ''نیچری'' فلسفیوں سے اُسے مناسب واقفیت ہے اور دیمقراطیس کے Materialism سے بھی آشنائی ہے۔ ایتھنز کے دیوزادوں: سقراط، افلاطون اور ارسطو کے افکار سے عقیدت کی حد تک ربط ہے۔

یہ آدمی جانتا ہے کہ وہ Nature اور کائنات کی حقیقت نہیں معلوم کر سکتا سو نہ صرف ''تشکیک کا درس'' دینے بیٹھ جاتا ہے بلکہ خود کو Agnostic مان کر کسی Supreme Being کے ہونے نہ ہونے کے سوال پر ہی ٹھہرا ہوا ہے۔

اسے اَدیان کی تاریخ اور علمِ کلام سے شغف ہے اور یہ خلیفہ المامون کے عہد کی معتزلہ controversy سے خوب واقف ہے۔

سینٹ اوگسٹین کی طرح یہ شخص سمجھتا ہے کہ خدا اور انسان کے بیچ کی خلیج پاٹی نہیں جا سکتی پھر بھی انسان کی روح خدا کا ادراک کر سکتی ہے۔

یہ شخص تسلیم وانکار اور مطلق سپردگی اور طے شدہ روگردانی اور love-hate کے جس مرحلے سے گزر رہا ہے، اس کے بارے میں خوب جانتا ہے کہ یہ اسے دو انتہاؤں میں سے کسی ایک تک پہنچا دے گا۔ یا پھر تیسری صورت میں اسے ایک دائمی Limbo میں پھینک دے گا۔

اس بے بسی سے نکلنے کی ایک صورت اسے اساطیر میں نظر آتی ہے سو وہ موسیٰ کی حکایت، پھر مسیح کے اُسطورے سے مدد لیتا اور Elijah سے اور John the Baptist سے (اور جی زَ زَ سے) اپنی شناخت قائم کرتا ہے۔ گمان کرتا ہے کہ یہاں شاید اسے اس کا اِلٰہ مل جائے گا۔

کہانی شروع ہوتی ہے تو یہ، جیز ز کرائسٹ کے get up میں کچھ سمبلز اُٹھائے اپنے 3، 4 حامیوں (حواریوں؟) کے ساتھ برآمد ہوتا اور عظیم چوراستے پر کرونوگراف کے سایے میں جا کھڑا ہوتا ہے (اگر کرونوگراف بِبلیکل ٹائم کا استعارہ ہے) تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ آدمی، جو سوانگ بھر کے آیا ہے مارے جانے لائق ہے۔ (Kill Him! Kill Him! Kill the Bastard!)

تاہم ایک کے بعد دوسری mishap سے گزر گزرا کے یہ واپس گھر پہنچتا ہے اور ایک جنون میں اُس اپنے 'مقصود' کو پکار کے کہتا ہے کہ میں تو خیال کی لطافت میں زندہ رہنا چاہتا تھا پر تُو نے یہ کیسی زندگی میرا مقسوم کی ہے؟ تو مجھے جینے مرنے کیوں نہیں دیتا؟ اے میرے دشمن! میرے دوست! یا تو مجھے اپنے ڈھنگ سے زندگی کرنے دے یا مر جانے دے ــــ آگے اس کا (اور کہانی کا) خاتمہ حسب حال ہوتا ہے۔

تو بس عزیزم! میں نے عہد نامۂ عتیق سے چند سطریں اور اپنے دوست جونؔ کی کسی نظم سے ایک مصرع لے کر انھیں قوسین میں درج کیا اور یوں اپنی کہانی میں Biblical Time سجیسٹ کرتے ہوئے اُس سے سرتاسر اسی ایک خوش بو میں بسانے کا جتن کر لیا۔

جونؔ سے مصرع quote کرنے کی (زبانی) اجازت لینے گیا تو اُسے کہانی سنانی پڑی۔ پھڑک اُٹھا میرا یار۔ پھر اس نے ایک دن بہت سے دوستوں (غازی؟ اطہر؟ علیم؟) کو اپنے کزن / دوست

۔(شمن صاحب) کے گھر کھانے پر بلایا اور دو بار کہ تین بار یہ کہانی پڑھوا کر سُنی۔

اگلے دن وہ میرے گھر آیا تو ایک بیاض لیتا آیا۔ کہنے لگا تو نے میرے جس مصرعے کو ایک آوازے یا 'ندائیہ instrument' کی طور پر لیا ہے ویسے تو وہ ٹھیک ہے۔ اچھا مصرع ہے— لیکن ذرا یہ بھی سُن لے، شاید اُس سے بہتر لگے۔ اور اُس نے یہ مصرع سنایا:

''ایادرازا! ایاہ یہنا! ایاہ یرفع! ایاہ بالا!''

اور اس نے وہ نظم 'راموز' سُنائی (جو اُس وقت تک مکمل نہ ہوئی ہوگی)! This is it— میں نے اپنے بیانیے سے جون کا وہ پہلے والا مصرع نکال دیا کیوں کہ اب مجھے جون ہی کی طرف سے ایک جھلملاتا، لشکتا آوازہ— ایک 'ندائیہ instrument' مل چکا تھا۔ پھر اُس نے ایک تجویز اور دی کہ اگر ہجوم کی کثرت ظاہر کرنے کو تُو یہ کہے کہ 'وہ تعداد میں اتنے تھے جتنے قبیلۂ بنو قیدار کے نخل' تو کیسا ہے؟

''نہیں میاں!'' میں نے کہا، ''یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ یہ میری زبان میرا idiom نہیں ہے... ناں، میاں ناں! پھر یہ بھی ہے کہ تیرے اِس قبیلے— بنو What-ever سے میرا کوئی تعارف نہیں ہے۔''

میں نے خود سے بھی کہا کہ اس کہانی میں scripture سے ایک اور دوست کی بیاض سے ایک quotation لے لیا، بس— کافی ہے۔

لیکن ایک ماہ کے عرصے میں وہ آدمی، جون ایلیا، عربی کلاسیکی ادب سے دو چار سندیں ایسی لے آیا کہ قبیلۂ بنو قیدار کو جگہ دینی ہی پڑی۔

ان باتوں کو 27 برس گزر چکے ہیں— اور اب ایک مزے دار صورتِ حال پھر سامنے آئی ہے۔

''راموز'' نظم کی اِس سطر میں، جس پر ہم بات کر رہے ہیں، شاعر کامل تخلیقی اُپج سے کام لیتے ہوئے تینوں dimensions یعنی: عرض، طول اور بلندی کی abstract entities کو گواہ کرتے ہوئے اپنا بیانیہ پھیلاتا ہے۔ وہ اپنی اُس نظم میں کچھ اور ہی مقدمہ بناتا ہے۔

اس کے برخلاف (اور یہ بات مجھے بہت اچھی لگی تھی کہ) میری کہانی کے context میں ہر ڈائمینشن اُس مطلق وجود کی بے شمار تجلیوں کی مظہر بن جاتی ہے کہ جو وجود اس کہانی کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اور پھر یہ بھی اطمینان تھا کہ کہانی کے مرکزی کردار کا مکالمہ یا تو non-entities کے ایک جمِ غفیر

سے ہے، یا ایک ''موجود/ناموجود'' سے — یعنی اُسی مطلق سے ہے — جب کہ جونؔ کی نظم ''راموز'' کے تیور خود کلامی کے تھے۔ (Please CHECK!)

درمیانی 27 برسوں میں میں بڑے آنند سے رہا — لیکن پھر مجھے اِس بی بی کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب "A History ...." پڑھنے کو ملی۔

معتزلہ کے بیان تک پہنچا تھا کہ اُس حوالے پر آیا جہاں بی بی نے ابنِ حنبل کے Obscurantism اور معتزلہ کے Rationalism کے بیچ مصالحت کی ایک راہ نکالنے کی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو ابوالحسن ابنِ اسمٰعیل الاشعری (878-941) نے کی تھیں۔ لکھتی ہیں:

'al' Ashari was trying to find a middle course between deliberate Obscurantism and extreme Rationalism. Some Literalists claimed that if the blessed were going to 'see' God in heaven, as the Koran said, He must have a physical appreence. Hishsham Ibne Haakim went so far as to say that: "Allah has a body defined, BROAD, HIGH, and LONG, of equal dimensions, radiating with light, of a broad measure in its three dimensions, in a place beyond place..."

مروادیا! — تو اصل میں یہ تھا برادرم جون کا پینترا۔ ''ایاہ پہنا! ایاہ بالا! ایا درازا!'' یہ عرض، بلندی اور طول، ایک مطلق وجود کی بے شمار تجلّیوں میں سے چند تجلّیوں کے مظاہر نہیں تھے (جیسا کہ میں سمجھا تھا) یہ تو اپنے literalist بھائی، ہشام ابنِ حاکم کی comic دلیل تھی جو پوری اس طرح ہے:

... in a place beyond place, like a bar of pure metal, shining as a round pearl on all sides, provided with colour, taste, smell and touch.

دیکھا آپ نے! کیا کمال بات سوجھی تھی میرے شیر کو! اور کیا استنباط کیا تھا... قربان جائیے۔

تو بس جونؔ بھائی (چِنٹ) نے اپنے پچھلے شہر امروہے میں، اپنے بابا سیّد شفیق حسن ایلیا صاحب کی کتابیں اُلٹتے پلٹتے، برسوں پہلے — اِس بونگے literalist ایچ آئی حاکم کو براہِ راست عربی سے اُٹھایا (کیرن بی بی جہاں بھی ہوگی اُس وقت 4 سے 6 سال کی ہوگی)۔

پھر اُس آدمی، جونؔ کی creative genius نے اور اُس کے مسخرے پن نے اس سے مصرع

کہلوایا کہ:ایاہ پہنا!ایاہ بالا!ایادرزا!...

کیا پتا بیک گراؤنڈ میں اُسے بھائی literalist کی آواز بھی سنائی دے رہی ہو کہ:

لاریب!تو اپنی پہنائی میں کمال چوڑا،اپنے قامت میں بے مثال بلندی کے ساتھ اور اپنی درازی میں مجردخیال سے بہرحال نکلتا ہوا ہے...اتنا کہ بیان کے احاطے میں نہیں آسکتا۔اور ایک لامکاں... ناں!ناں!مکاں سے سوا ہے تو۔اور ایک فلزِ خالص سے بنی 'چیز' کہ سلاخ ہے،ایک ہر رخ سے چمکتا ہوا(مکمل) گولائی والا موتی ہے اور تو رنگ،مزے،خوش بو اور لمس سے مزین ہے...معاذ اللہ۔بلکہ لاحول!

اوپر جو لکھا ہے میرے اپنے deductions ہیں جو کتاب 'A History of God' کے دیے quotation اور 'راموز' نظم کی بس ایک سطر کی شہادتوں پر مبنی ہیں۔وہ نظم جون کے archives میں ضرور کہیں موجود ہوگی۔علیم اور اطہر تو روانہ ہوئے۔ہاں،غازی صلاح الدین،برادرم شمن صاحب، بھائی بچپن اور بھائی راحت سعید — عمریں ان کی دراز ہوں — معلوم کریں گے تو 'راموز' دستیاب ہوجائے گی۔

میاں بیبن مرزا!دیکھا آپ نے؟بہتر کا سنگِ میل پار کر چکا تو میں خود کو رفتگاں کے ہجوم میں پاتا ہوں (its a good company, though)۔

اور یہ ایک شخص جون تو جیسے میرے لیے obsession سا بن گیا ہے۔

لیکن آپ ہی بتائیے ایسا بے دریغ،بے درنگ(امکانات سے چھلکتا ہوا) کوئی اور جدید نظم گو آپ کی نظر میں ہے؟میں یہ بات اُن(زیادہ سے زیادہ 25)نظموں کی اتھارٹی پر کہہ سکتا ہوں جو ہم نے شاعر سے سنی ہیں یا وہ جو رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔

اسے،اس آدمی کو،ایسی ایسی ڈھائی ہزار نظمیں لکھنی تھیں۔لیکن وہ ذہنی اور شارجہ اور(بُش کے) امریکا جاجا کے 'منحی منحی' بھر جو لے جانے والوں کے اِزدحام کو(اَژدَھے کہنا چاہیے اَژدَھے)...'تم میرا نام کیوں نہیں لیتیں' سنا سنا کے داد لیتا رہا۔خبیث!

اب ایک امکان یہ ہے کہ دانتے کے تیار کیے ہوئے برزخ میں وہ سقراط اور اووڈ جیسے دیوزادوں(دونوں Estb. کے معتوبوں)کی معیت میں گھاس پر بیٹھا ہوگا۔ممکن ہے وہیں کہیں

صلاح الدین ایوبی صاحب بھی ہوں۔ اور ہو سکتا ہے نہ بھی ہوں۔ کس لیے کہ میاں دانتے نے سکندر اعظم کو بھی اپنی Purgatory میں متمکن دکھایا تھا... چلو خیر ہے۔ جہاں رہے خوش رہے اپنا بھائی۔

اپنی بعض کہانیوں کے بارے میں

1۔ ناممکنات کے درمیان

بھائی مبین مرزا! اس بار کچھ اپنی کہانیوں پر گفتگو رہے گی۔

تو آیئے پہلے کہانی 'ناممکنات کے درمیان' پر بات کی جائے۔

یہ سو فی صد فینٹیسی ہے۔ اس کا آغاز ایک نظم سے ہوتا ہے۔ نظم ایک طبع زاد mythology ہے، گویا اس قلم کار کی گھڑی ہوئی ہے۔ ہندو اسطورے میں خالقِ کُل 'برہما' ہے۔ میری نظم میں ایسا نہیں ہے۔

ہندو مائی تھالوجی کے تین بنیادی ارکان ہیں [جو Christianity کی تثلیث یا Trinity سے قطعی مختلف ہیں کہ وہاں خدا باپ، خدا بیٹا اور خدا روح القدس ہیں] ہندو مائی تھالوجی کے تین: برہما، وشنو، شوا ہیں۔ پہلا ہے:

God the Creator، دوسرا God the Sustainer، تیسرا God the Destroyer۔

میری نظم کا واحد کردار، آدی پُرش ہے:

آدی (مطلب پہلا، شروع کا، ابتدائی) پُرش (مطلب آدمی، مرد، انسان)

سامی مذاہب میں یہ آدم ہے۔ ہندو دھرم میں یہ برہما ہے۔ ہمیں جو بات عجیب لگے گی، یہ

ہے کہ برہما پہلا آدمی بھی ہے اور God the Creator بھی۔ مسیحیت میں بھی ایسا ہی التباس ڈال دیا گیا ہے۔ انھوں نے خدا بیٹے کے فرائضِ منصبی، خدا کے بندے اور نبی عیسیٰ علیہِ السّلام عیسیٰ کو سونپ دیے ہیں۔ خیر، اب ہم اسدم خ کی فینٹیسی (آکٹوپس...ایک نظم) پر بات کریں گے:

میرا بیانیہ ہندو مائی تھالوجی سے ایک کردار (میرا کوٹا کا برہنہ مجسمہ) عاریتاً لیتا ہے۔ میں اُسے آدمی پُرش کا نام دیتا ہوں اور پورے protocol کے ساتھ اسے ایک روحِ زندہ سے مزین کرتا ہوں۔

اس کھیل میں، میں نے مغل عہد کے عظیم شاعر گوسوامی تُلسی داس سے یہ ایک سطر لی ہے:

جاگیے برج راج کنور، جاگیے، کنول کُسم پھولے۔ [اللہ غنی! کیا شاعر ہے تُلسی داس!]

یہ شری کرشن جی کی اُستتی (یعنی مدح میں لکھی گئی نظم) سے ہے۔ پوری نظم پڑھیے، رقص کرنے لگیں گے آپ۔

شری کرشن جی، وِشنو کے اوتار ہیں، اس لیے 'جاگیے برج راج کنور' [کرشن جی کو علاقہ 'برج' کا شہزادہ بھی کہا جاتا ہے] کی معنویت بھی غور طلب ہے۔ تو لیجیے، نظم میں 'کھنکھناتی مٹی والے وجود' میں ایک روحِ زندہ حلول کرتی ہے اور 'یک خلیاتی' زندگی کا کنول کھِل جاتا ہے۔ یہ so-called برہما، جو میری اس نظم میں خالق سے زیادہ مخلوق ہے، سات ڈھنگوں سے اپنی انگلیاں ملا کر زندگی کو سلام کرتا ہے۔ اُس کی آٹھویں مدرا روحِ زندہ کے لیے ہے۔

آکٹوپس — ایک منظر سے پہلے جو نظم ہے، اُس میں آٹھ [سات جمع ایک] 'مدراؤں' کا ذکر ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ so-called برہما نے، ناچتے ہوے، سات ڈھنگوں سے اپنی انگلیاں ملا کر (مدرا کرتے ہوے) زندگی کا آدر کیا تھا (تعظیم کی تھی)، اور یہ کہ اُس کی آٹھویں مدرا، روحِ زندہ کے لیے تھی۔

اب منظر میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم صرف محرابیں بنانے والی، اپنی طرف اُمڈ آنے والی سات سونڈیں ہی دیکھ سکتے ہیں — اور یہ کہ جو (آٹھویں) سونڈ، عقب میں اُفقی نٹی کی طرف بڑھ گئی ہے، جسے ہم تم نہیں دیکھ سکتے، وہ ہمارا تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔ یہی prime statement ہے اور اس کے بین السطور یہ بیان موجود ہے کہ ہم اور تم، کبھی دو ناممکنات کو ملانے والے پُل کے رُو بہ رُو ہیں اور اُس التباس

(الیوژن) کا سامنا کر رہے ہیں جسے تخلیق کے روزِ اوّل سے ہمارے متھے مار دیا گیا تھا، [expression کے لیے معذرت!] میں پھر دُہراتا ہوں کہ جو سونڈ عقب میں انگی نئی (گویا روحِ زندہ) کی طرف بڑھ گئی ہے — جسے ہم تم نہیں دیکھ سکتے، وہ ہمارا تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔ !Period

منظر کے فرش پر دور تک متحجر (fossilized) لہروں کا جال بچھا ہوا ہے، مگر یہ optical illusion ہے جو منظر بیان کرنے والے 'میں' کو دوڑنے (یا رقص کرنے) اور اپنے پیروں کی دھمک سے پھر ایک بار چیزیں پیدا کرنے پر اُکساتا ہے — تاہم اس سارے عمل کا نتیجہ خفت اور ناکامرانی ہے۔

کہانی کہنے والے کا بیان ہے کہ وہ روحِ زندہ کا بوجھ اُٹھائے دوڑا ہے۔ تو یہ ہر اُس تخلیق کار کا مسئلہ ہے جو محسوسات کے اس mad house کو، اس خوابِ پریشاں کو، نیلے امن [یا rationality] کے پھیلاوے میں بدل دینے کا خواب دیکھتا ہے۔ کہانی اسی فرسٹریشن کو فوکس کرتی ہے۔

2۔ ایک وحشی خیال کا منفی میلا پن

کہانی 'ایک وحشی خیال کا منفی میلا پن' پر بات ہوگی: یہ اصل میں بندر روڈ کی کہانی ہے۔

بندر روڈ کی میری یادیں، ظاہر ہے، زمانی اعتبار سے، آپ کی یادوں سے مختلف ہوں گی۔ بہت سے لینڈ مارکس بدل چکے ہوں گے، شاید آپ نے 'جامع کلاتھ مارکیٹ' سے پہلے ریڈیو پاکستان کے بس اسٹاپ کو 'ہمیشہ سے' یوں ہی اجڑا ہوا دیکھا ہوگا۔ میں نے اسے زندگی سے — ایک بامعنی زندگی سے چھلکتا ہوا دیکھا ہے۔ اس رونقوں والے 'بھاگوں بھرے' اسٹاپ پر تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک بے مثال مصور صادقین، اب موٹر رکشے سے نہیں اُترتے ہوں گے۔ اُس وقت وہ پیرس سے نام کما کے پاکستان لوٹے تھے اور جب جی کرتا تھا اپنے دوست، شاعر عزیز حامد مدنی سے ملنے ریڈیو اسٹیشن آجاتے تھے۔ یہیں ایک بار میں نے علامہ رشید ترابی قبلہ کو، بہت ہی نرمی سے، ریسپشنسٹ سے یہ کہتے سنا تھا کہ "عزیزم! ہم ملنے جا رہے ہیں، چلے جائیں؟" اُس بھلے آدمی نے علامہ صاحب کو کبھی دیکھا نہ ہوگا؛ تو سرسری سا پوچھنے لگا کہ کون صاحب ہیں، آپ کس سے ملنے آئے ہیں؟

میں نے گزرتے ہوئے یہ سنا اور دوڑ پڑا، "اے بھائی! کیا کہہ رہے ہو؟ آپ علامہ ترابی صاحب

ہیں!'' وہ گھبرا کے اُٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھوں سے سلام کرنے لگا۔ ترابی صاحب نے ''ناں بیٹے! کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں،'' کہتے ہوئے ہمارے سلاموں کا جواب دیا؛ پھر دعائیں دیتے، سر پہ ہاتھ رکھتے، بخاری صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ تو یہ اسٹاپ ذوالفقار علی بخاری کا اور سلیم احمد کا، مدنی صاحب کا اور شاہد احمد دہلوی صاحب کا اور غلام عباس صاحب کا— اور بھی کتنے ہی بے بدل، ادیبوں عالموں شاعروں کا زمنہ تھا۔

یہاں کبھی اُستاد بڑے غلام علی خاں صاحب اور اُستاد بندو خاں صاحب جیسے بے مثال گائیک اور کلاونت آتے اور اپنا جادو جگاتے تھے... میاں کہاں گئے وہ لوگ!

یعنی ہر بساط کی طرح یہ بساط بھی اُلٹ گئی؟ جونؔ ایلیا کہتا ہے: ''ہاں وہ بساط الٹ گئی...''

خیر، میری یہ کہانی ریڈیو اسٹیشن سے بالکل ملے ہوئے، جانوروں کے اسپتال اور ایس پی سی اے یعنی Society for Prevention of Cruelty to Animals کے زونل آفس سے اور یہاں سے کوئی دو فرلانگ آگے سٹی کورٹ اور سٹی کورٹ کے عقب میں کچھ دور دس بارہ بکھری ہوئی لوکیشنز میں بٹے کراچی یونی ورسٹی اولڈ کیمپس کی کہانی ہے جس میں ٹھیک بندر روڈ پر واقع کے ایم سی کے سامنے اور اُس کے پیچھے ہونے والے ایک بھیانک واقعے کا ذکر (موجود ہے؛ اور نہیں بھی ہے)... کہ جب سن 53ء میں پاکستان میں پہلی بار (گورمانی کی وزارتِ داخلہ کے دَور میں) نہتے طلبہ پر سرکاری بندوقوں سے فائرنگ کی گئی تھی اور چار لڑکے مارے گئے تھے۔

[اس سے اگلا واقعہ (شاید) سنہ 70 میں ڈھاکا یونی ورسٹی کیمپس میں ہوا ہوگا] واللہ اعلم۔

برادرم! میں کراچی پورٹ ٹرسٹ میں نوکری کرتا تھا اور انگریزی ادب کا طالبِ علم تھا، تو اسی اولڈ کیمپس میں پہلے تین پیریڈز پڑھنے آیا کرتا تھا۔ مجھے بہرصورت بارہ بجے تک آفس پہنچنا ہوتا تھا تو کیمپس سے نکل، جھٹ بندر روڈ پہ آ کر، اگلی بس پکڑنی ہوتی تھی جو مجھے چار یا چھ میل دور ویسٹ وہارف پہنچا دیتی تھی۔ اس طرح بارہ سے پانچ بجے تک میں اپنا دفتر کا کام کرتا تھا۔ پھر گھر— اور کیوں کہ گھر کہیں نہیں تھا، اس لیے میں رات گئے تک گھومتا یا پارک وارک میں پڑھتا اور کبھی اِس کزن کے ہاں، کبھی اُس کے ہاں سو رہتا تھا۔

میں صبح کو جلد کیمپس آتا اور وہیں کسی چائے خانے میں ناشتا کرنے کے بعد، اپنے شعبے کے کھلنے کا انتظار کرنے لگتا تھا۔ ہاں، بندر روڈ سے شعبے تک پہنچنے کے لیے مجھے سٹی کورٹ کے کمپاؤنڈ سے یا اُس کے سامنے سے گزرنا ہوتا تھا — تو پام، کینا، کروٹن کے گملے اور پان کی پیک سے بے حال کوریڈور وغیرہ — یہ بھی منظر ایک ڈیڑھ برس میرے ساتھ رہے تھے۔

ایک حوالہ اس کہانی میں 'یانان سی' حیدر کا ہے۔ یہ میرے پرانے دوست تاج حیدر کا حوالہ ہے جو بائیں بازو — یا پی پی کہہ لیجیے — کے سچے، دیانت دار رہ نما ہیں۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ وہ ایک زمانے میں ماؤزے تنگ کی اور یانان کلچرل فورم کی خوب خوب باتیں کرتے تھے۔ میرے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ شخص، ام خ بے شک ایک دردمندی کے ساتھ بائیں بازو کی طرف اپنا جھکاؤ رکھتا ہے لیکن اِس جیسے نستعلیق کامریڈ بس اتنے legit ہوتے ہیں کہ جتنے سرسری مسلمان زادے، جو خیر کو اپنی زبان سے تو برابر اچھا کہتے ہیں مگر اُس کے نفاذ کے لیے پلک تک نہیں جھپکاتے۔

تو صاحبو! اب یہ ہے کہ اللہ ہی اللہ ہے!

3۔ ہے لَلاّ لَلاّ

اس کہانی کو میں نے 72ء سے 75ء کے دوران لکھا ہوگا۔ یہ میرے 1982ء کے مجموعے میں شامل ہے۔

آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم لوگ، کہانی لکھنے کا کام عادتاً اور کسی اندرونی urge کے تحت کرتے رہتے ہیں، تاہم یوں بھی ہوتا ہے کہ ایسا کوئی واقعہ سامنے آتا ہے جو ہمیں ہلا کے رکھ دیتا ہے (یا ہم سوچ میں پڑ جاتے ہیں) اور فوری طور پر اس کیفیت کو اپنے میڈیم (افسانے) کی مدد سے ریکارڈ کر لیتے ہیں۔

یہ کہانی میں نے پی ٹی وی کراچی سینٹر میں پیش آنے والے ایک ایسے واقعے سے متاثر ہو کے، جس نے مجھے ہلا کے رکھ دیا تھا، دو تین روز میں لکھ ڈالی تھی۔ ویسے، بات اتنی کوئی گمبھیر نہ تھی۔

میں ٹی وی کے لیے گیت اور plays لکھا کرتا تھا۔ ایک موسیقار اور 'خیال گائیکی' کے نام ور گائک اُستاد عاشق علی خاں سے، جو میری طرح کم آمیز تھے اور 'لیے دیے' رہتے تھے، میری اور

دوست علیم کی ایسی محبتیں ہو گئی تھیں کہ خود ہمیں حیرت ہوتی تھی۔ ہم professionally تو مصروف رہتے ہی تھے، اب یہ ہونے لگا کہ میں کسی بھی کام سے ٹی وی سینٹر آتا تو اُستاد عاشق علی کے 'میوزک روم' میں آ بیٹھتا۔ اُن سے (بیشتر) راگوں کی اور بڑے گائیکوں، موسیقاروں کی باتیں سنتا رہتا۔ علیم بھی فارغ ہوتے تو آ جاتے۔

یوں سمجھیے یہ، مجھ 40 plus آدمی کے لیے، موسیقی کے بارے میں 'سیکھنے اور بہرہ مند ہونے کا' سنہرا دور تھا۔

استاد کو (کسی بھی ٹی وی کے ملازم کمپوزر کی طرح) چوتھے گریڈ میں رکھا گیا تھا — جو وہاں کلرکوں (یا شاید دفتریوں) کا گریڈ ہوتا ہے۔ and mind it خیال گائیکی کے اُستادوں میں اُس وقت بھی بس اتنے ہی فن کار تھے کہ اُنھیں ایک ہاتھ کی انگلیوں پہ گنا جا سکتا تھا۔

مگر وہ بڑے صبر والے (یا مجبور) آدمی تھے۔ ایک بار مجھ سے، علیم سے، کہنے لگے کہ مجھے آٹھ سال کی عمر سے راگ داری سکھائی گئی تھی، اب کوئی پچاس برس سے، دن اور رات، اسی بھاگ بھرے علم کی سنگت میں ہوں۔ اگر اپنے کٹم کے بچوں کی طرح بی اے، ایم اے کی پٹڑی سنبھالتا تو کم از کم ایک پی ایچ ڈی تو کر چکا ہوتا — پھر کیا جب بھی یہ مجھے گریڈ چار میں رکھتے؟

وہ عجیب اور دکھ والی بات، جس نے مجھے لرزہ دیا، کسی گریڈ ور یڈ یا پروموشن سے متعلق نہیں تھی۔ وہ اُن کی بے مثال کامپوزیشنز سے متعلق تھی۔

یہاں میں استاد عاشق کی چند خوب صورت دُھنوں کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ اوروں کا تو مجھے اب یاد نہیں، بس اپنے لکھے یہ گیت یاد دلا دوں گا، جو آج بھی شاید اپنے کامپوزیشن کی وجہ سے گائے جاتے ہیں: مثلاً انوکھا لاڈلا، پیا ترس گئے مورے نین، تو ہی کرے پار میری نیا، میرے اللہ۔ وغیرہ...

ہاں علیم کی یہ غزل بھی یاد آئی، کچھ دن تو بسو میری آنکھوں میں۔

میرے گیت کا یہ مکھڑا 'انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند'، راگ درباری کی اصل لائن ہے۔ استاد عاشق علی کا اصرار تھا کہ میں اپنے گیت میں اِسے اسی طرح رہنے دوں۔ چناں چہ یہی ہوا۔

اُن کا کہنا تھا کہ اس گیت، اور اپنے دوسرے کام کی inspiration لینے وہ حضرت لعل شہباز قلندر

کے آستانے، سیہون شریف گئے تھے اور وہاں سے جیسے رنگوں میں نہائے ہوئے لوٹے تھے۔

یہ اُن کی productivity کا بہترین دور تھا۔ انھی دنوں ٹی وی نے اپنے ہر اسٹیشن سے موسیقی کے پروگرام طلب کیے اور یہ کہا کہ بہترین گائیک، کمپوزر اور پروڈیوسر کو نہال کر دیا جائے گا اور یہ کہ 'وہ' بھی کیا یاد کریں گے کہ خدار کھتے تھے۔ کراچی سینٹر والوں نے کہا کہ اُستاد! آپ جو سیہون سے سوغات لائیں ہیں، رب کرے گا تو یہ چوبارے چڑھے گی، سینٹر کا نام اونچا کرے گی۔

اُستاد عاشق علی نے اُن کرتا دھرتا لوگوں کے اس دعائیہ کومینٹ پر کس طرح react کیا ہوگا، مجھے نہیں معلوم، اتنا جانتا ہوں کہ وہ منکسر آدمی تھے، تو بس انھوں نے مسکرا کے سر جھکا لیا ہوگا۔ خیر، یہ 'مقابلہ' حسبِ دستور پروڈیوسروں اور اُن کے ممدوح بیوروکریٹس کے بیچ ایک گھمسان کی لڑائی کی صورت اختیار کر گیا اور ایسا ہوا کہ مغرب سے (درآمدہ) چلتی ہوئی دُھنوں سے ترتیب دیے کراچی ہی کے دوسرے نمبر پروگرام کو قابلِ انعام قرار دیا گیا... ایک گیت کو فخرِ موسیقی یا ایسا کچھ کہا گیا (اُس کے بول تھے، ایس یو این، سَن)۔ کسی چپڑ قناتی لونڈے نے 'جھالر لگے پنڈلی بوٹ' پہن کر ایلویس پریسلی کی طرح ہلتے جلتے گایا تھا۔ بات ختم ہوگئی۔

مگر بات ختم نہیں ہوئی۔ چند ہفتے بعد عاشق علی خاں صاحبِ فراش ہوئے اور کچھ روز بعد خبر آئی کہ خیال گائیکی کا عاشق چلا گیا۔ اِنا اللہ... خبر ٹی وی سے نشر ہوئی۔ علیم کسی سلسلے میں کیمرا یونٹ لے کر اندرونِ سندھ گئے ہوئے تھے۔ جون ایلیا کو میں نے فون پر خبر سنائی؛ کہنے لگا چل، اُن کے گھر والوں کے پاس بیٹھ کے رو لیتے ہیں۔ میں نے کہا، تو تیار ملنا، رکشا لے کے آرہا ہوں۔ گھر کا عام سا پتا معلوم تھا کہ گانے بجانے والیوں کے بدنام محلے، جاپانی روڈ پر کسی بالاخانے کی چھت پہ اُن کی رہائش تھی۔ تو اسی رَو میں اپنی اُجاڑ صورتیں لے کے، گریہ ناک ہوئے، ہم رنڈی بزار پہنچے۔ استاد کا نام لے لے کے دُکان داروں، رہ گیروں سے پوچھا۔ عاشق علی خاں کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ گلیوں میں نکل گئے: تو پیشانیوں پہ بال جھٹکائے دو تین لونڈے لپاڑی قریب آئے، ایک نے کہا کہ سر! مزہ آجائے گا ایسا تازہ مال ہے، ایمان سے! میں چکرا گیا، پر جون گلوگیر آواز میں بولا، ''میاں! ہمارا دوست مر گیا ہے! یار، ہماری تو خود دُ ما لی پھٹ گئی ہے، ہم کیا مزے کریں گے!'' آخر، پان کی دُکان

پہ کھڑی ایک نائیکہ ٹائپ بائی جی نے کہا، 'فتح علی کے بابا کا تو نہیں پوچھ رہے؛ وہی جو لڑکیوں کے ٹوشن لیتا ہے؟ ہم نے کہا ہاں، انھی کو پوچھ رہے ہیں۔ اس بھاگوں والی نے پتا سمجھا دیا۔ باقی جیسی جگہ تھی، وہ تو آپ نے کہانی میں پڑھ ہی لیا ہوگا۔

فتح علی سیڑھیوں سے اوبڑ کھابڑ قدم لیتا دوڑتا ہوا آیا، گلے سے لگ کے رونے لگا۔ اوپر لے گیا، تایا سے ملایا۔ میں انھیں ریڈیو پہ سنتا تھا۔ اُستاد عاشق کی، ان کی جوڑی، نزاکت سلامت جیسی جوڑی تھی۔ یہ خیال گائیکی کا بچ رہنے والا دوسرا ستون تھے۔ جون سے، مجھ سے رو کے کہنے لگے کہ صاحب! میرا سیدھا ہاتھ کٹ گیا۔ گھرانے کا طُرّے وال چلا گیا۔ ننگے سر ہو گئے ہم۔

عزیزم! وہ کہانی جس کی میں بات کر رہا ہوں، تھرو آؤٹ strong worded ہے۔ اب آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں نے آواز کو اپنے وجدان میں تراشنے والوں اور اپنے testes میں تلاش کرنے والوں کی جو واضح حد بندی کی ہے اور اپنے idiom کو سر تا سر تیکھا اور تیز رکھا ہے تو یہ اس دُکھ دائیک افسانے کی مانگ ہے، کسی طرح کی gimmickry نہیں ہے۔

ہمارے فنونِ لطیفہ پہ جیسا وقت پڑا ہے، یہ ہم سب خوب جانتے ہیں۔

کیا اردو، کیا ہندی — ہمارے مرتے ہوئے میڈیا کے سورج کے یہ بے جان، دھبے — برص کے یہ داغ بڑھتے، پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ کیمروں، مائیکروفونز کے آگے بے شمار چیڑ قناتی، حرام خور، جھالر لگے بنڈلی بوٹ پہنے سسکیاں لے رہے ہیں کہ ایس یو این SUN، ایس یو این SUN۔

4۔ موتبر کی باڑی — 5۔ سرکس کی سادہ سی کہانی

عزیزم! ان دو کہانیوں کے بارے میں پڑھنے والے کا عام تاثر کیا ہے پہلے میں اس پر بات کروں گا۔

اوّل الذکر، ایک بیانیہ کہانی ہے جس میں ہمیں عام سے کرداروں کے گروپ ملتے ہیں۔ یعنی:

(الف) لڑکی آلی اور اُسے لے کے بھاگنے والا گندمی کا لڑکا جو اپنا نام ٹھاکر فلاں بتاتا ہے۔

(ب) باڑی کا موقعے پر موجود موتبر اور سلامیہ گاؤں میں متعین پولیس کا تین فیتوں والا۔

(ج) 'سپھری صاحب' علاقے کا ڈی ایس پی اور اُس کی تِل والی نیلما جو باڑی کی بہو ہے۔

(د) ناشتا لانے والی عورت، گارڈ، ہولوشکل کا آدمی جو ناتا س لایا ہے...اور بس۔ باقی لوگوں کے بارے میں ہم قصہ گو راوی یا کرداروں سے صرف سنتے ہیں، اُنھیں move کرتے نہیں دیکھتے۔ آپ نے دیکھا؟ major اور فعال کرداروں میں دو دو کے تین سیٹ ہیں... گویا کل چھ آدمی۔ صرف تین minor کردار ہیں جو کیمرے کے سامنے آتے اور بس گزرتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی یہ معلوم ہوا کہ اصل میں کہانی کو چلا رہے ہیں چھ آدمی اور راوی۔ اللہ اللہ خیر سلا!

یہ passion اور نفسی پیچیدگیوں کی اور ایک احمقانہ (جووینائل) کارروائی کی straight کہانی ہے۔ (علامتی نہیں ہے) جسے میرے اور آپ کے بزرگوں منٹو، بیدی، قاسمی — کسی ایک نے بھی قلم برداشتہ لکھ دیا ہوتا — (اور اس عاجز سے اچھا لکھا ہوتا) گویا بہر حال nut shell result موجود ہے۔ کسی کو حیران و سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاہاہا!

گندھی کا لڑکا، آلی کو لے کے بھاگتا ہے۔ دونوں نے احمقانہ سا فیصلہ کیا ہے کہ بارڈر پار کر کے 'ننگر پارکر' چلے جائیں گے جو تھر کا علاقہ ہے۔ سنا ہے اُدھر ہندو بھی رہتے ہیں اور بال ودھواؤں کی دوسری شادی پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ یہ دھر لیے جاتے ہیں، اور باڑی میں، جہاں ایک غیر معمولی صورتِ حال میں بڑی بہو اپنی عائلی زندگی گزار رہی ہے، بند کر دیے جاتے ہیں۔ اگر یہ فرسٹریٹڈ عورت اُن حالات سے نہ گزر رہی ہوتی جو کہانی میں بتائے گئے، اگر اُس کا کا نٹا socalled 'موتبر' سے "صنّی سے" جڑا رہتا، اگر 'سیٹھری صاب' بالکل ہی نچڑا ہوا پھکیت نہ ہوتا، اگر اُس میں کچھ دم خم ہوتا؛ اگر وہ گندھی کے لڑکے کو بالکل ہی نمٹانے کا فیصلہ نہ کر لیتا، اور اگر نیلما بہو "عشق پیالہ پی کے، سرنذرانہ دینے" کا فیصلہ نہ کر لیتی، تو یہ کہانی کہنے لائق نہ تھی۔

اگلی، یعنی 'سرکس کی سادہ سی کہانی' کے عنوان ہی میں کہانی کار نے قاری کو اشارہ دے دیا ہے کہ یہ کوئی سادہ سی کہانی نہیں ہے۔

یاد کیجیے، انور سجاد کی کہانی 'گائے' اور خالدہ حسین کی کہانی 'سواری' بالکل اسی طرح کی غیر سادہ سی کہانیاں ہیں۔ ابتدائی سطروں ہی میں پتا چل جاتا ہے کہ یہ دونوں دوست کچھ گڑبڑ کرنے پہ تلے ہیں۔ یہاں جو سرکس دکھایا جا رہا ہے، یہ بھی تماشوں سے الگ تماشا اور دوسرا کوئی سرکس ہے۔ اس

کے کرداروں میں، اُن کے مینرازم، یا بی ہے ویئرز میں، اُن کی نشست و برخاست یا موومنٹ میں، اُن کے مکالموں کے لفظ لفظ اور ملبوسات تک میں — 'قد بُت' میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے جو پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ یہ جو کچھ ہے، face value پہ اِس کا اعتبار نہ کیجیے، یہ کسی اور منطقے پر، کسی ہوگزرے — اور جاری قصے کا بیانیہ ہے۔ رِنگ ماسٹر، رکھیل بیلا جی بونی اور باقی کے بونے اور شیر کی کھال سے بنا کوسٹیوم پہنے، گل مچھوں والا وہ سُسرا ادھ ننگا باڈی بلڈر آسو بلا، یہ سب جو سرکس کھیل رہے ہیں، ایک unsuspecting کمیونٹی پر کھیلا جارہا ہے۔

بادل الیکٹریشن کی بات پوری توجہ سے سننے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا ہے:

'دوست اِدھر بڑا کڑکی ہے — ویسے تو سرکس چل ہی نہیں رہا؛ اور جو تھوڑا بہت آتا ہے، وہی تینوں مردار آپس میں بانٹ لیتے ہیں، ورکروں کو وعدے وعید کے سوا دیتے ہی کچھ نہیں۔ بے زبان جانوروں تک کو بھوکا مار رکھا ہے — کدھر جاوے، سب لوگ کا شناختی پرچی سرکس کے ساتھ ہے۔ ویسے بھی باہر کے حساب سے دم لیاقت کوئی نہیں ہے۔ نہیں کام ملے گا نہیں کچھ'

''سفید گایوں کا میسا کر'' اخبار ''ڈان'' میں پڑھے گئے کالم سے مدد لیتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ یہ نام ورکالسٹ بریگیڈیئر (ر) اے آر صدیقی کی تحریر ہے۔ کالم کا سالِ اشاعت کہیں فون کر کے معلوم کر لیجیے گا۔

''ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے، میرے خیال میں، ایک amalgamation ہے۔ یہ میرے لکھے سفرنامے، قصے، کہانی، essay، نظم، گیت، مکتوب، تراجم، اِسکرپٹ، ہذیان اور inspiration وغیرہ سے مل کر بنتا ہے۔ عین ممکن ہے اِس کے کچھ (یا بیشتر) حصے boring ہوں۔ تاہم جیسا ہے، جہاں ہے، یہی ہے۔ ہاہاہا!

6۔ سارنگ

کہانی 'سارنگ' کے بارے میں کچھ باتیں:

یہاں کہانی کے کرداروں کے بارے میں پہلے میں کچھ وضاحت کرنا چاہتا ہوں:

یوں سمجھیے کہ ہندو مائی تھالوجی کے تین بڑے ستون ہیں: برہما، وِشنو، شنکر۔ گویا تخلیق کرنے، پالنے، اور خاتمہ کرنے والا۔ Deep down ہندو معتقدات کی تفسیر یوں بھی کی گئی ہے کہ لگتا ہے، یہ تینوں صفات ''تری مورتی'' میں یک جا ہو گئی ہیں جو پرمیشور یا کہ ربّ الارباب جیسی ہستی ہے۔ یعنی وہ واحد ہے اور مجموعہ ہے خلاقیت کا، ربوبیت کا، اور قیامت گری کا۔

اب آگے سنیے، یہ تینوں برہما، وِشنو، شنکر اپنا اپنا ایک 'خاندان' رکھتے ہیں، جو اس طرح ہے:

برہما کی رفیقہ سرسوتی (سرود، گویائی اور علوم کی دیوی)۔ وِشنو کی رفیقہ لکشمی (دولت کی دیوی) اور شنکر کی رفیقہ پاروتی یا دُرگا، جن سے پیدا ہوئے گنیش جی۔ گنیش کا چہرہ ہاتھی کا ہے۔

تو ان اساطیر کو مقامی Legends میں متبدّل کرتے ہوئے صدیوں کے دورانیے میں، برصغیر کے طول و عرض میں، ہندو دھرم کی بے شمار داستانیں وجود میں آئیں۔ کہا گیا کہ وِشنو، نے ہر یُگ میں اپنا اوتار بھیجا ہے۔ اِس معلومہ فہرست میں دو نام ہیں: ایک اوتار ہیں شری رام چندر جی اور ایک شری کرشن جی۔ اوتاروں شری رام چندر جی اور شری کرشن میں، پہلے کی رفیقہ سیتا ہیں اور دوسرے کی رادھا، (اوتار یعنی آدمی کے روپ میں آنے والا اِلٰہ) لوک گیت کی لائن ہے: ڈھولا آدمی بن کر آیا...

اب ہم کہانی کی طرف آتے ہیں:

میری کہانی کے مرکزی کرداروں میں شیو شنکر اُن کی رفیقہ پاروتی اور گنیش جی شامل ہیں۔

شیو شنکر کے کتنے ہی نام ہیں: مہادیو، اُماوَر، دگمبر، مہیش، گر یجا پتی، کرونامیے (رحم کرنے والا)

پاروتی کو دُرگا، شیوا اَردھانگی (شیو کے آدھے اَنگوں والی) جگت ماتا، شیراں والی، گریجا، اُما، چنڈی۔

گنیش کو گنپت، گجانند، گریجانند وغیرہ کہا جاتا ہے۔ ماں نے اسے کیتو (عقل، چمک) کہا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے طول و عرض میں کہیں اِن تین میں سے ایک کی پوجا پہ توجہ دی گئی، اور کہیں دوسرے یا تیسرے کو پسندیدہ معبود مانا گیا۔

وسطی علاقوں اور جنوب میں گنیش اور لکشمی کی پوجا زیادہ ہوئی۔ مغربی علاقے بنگال وغیرہ میں گنیش کو کم، دُرگا ماں کو زیادہ عقیدت ملی۔ وسطی ہندوستان اور یوپی صوبے میں وِشنو کے اوتاروں،

رام اور کرشن کی بھگتی پر زور دیا جاتا ہے۔

بنگال میں اور جنوبی ہند میں پاروتی کے بھینکر روپ: دُرگا، چنڈی اور شیراں والی پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ یہ برائی کا، راکھشسوں اور غلط کاروں کا وِناش (یعنی خاتمہ) کرنے والا روپ ہے۔

میری کہانی میں شیوشنکر اور پاروتی کا شفیق روپ دکھایا گیا ہے۔ دَلت یعنی پٹے ہوئے، مسلے ہوئے نوجوانوں کو ماں پاروتی، چاہت میں ڈوبا دیکھتی اور انھیں پھول پھینک کر نوازتی ہے۔ اسی طرح جب لڑکی، مہادیو کو ساکشی/ گواہ بناتی ہے تو شنکر کا ڈمرو (ڈگڈگی) بجتا سنائی دیتا ہے۔۔یعنی بے نواؤں کے والی، کرونامیے شیوشنکر کی آمد کا اعلان ہوتا ہے۔

آخری سطریں ہندو دھرم کو ماننے والے قاریوں کی جمالیات پر (شاید) گراں گزریں گی، یعنی وہ مرحلہ؛ جہاں پٹے ہوئے، دَلت جوڑے کو شنکر کی مسند یعنی باگھمبر (شیر کی کھال) پر میتھن (مِلن) کرتے دکھایا گیا ہے۔ بڑھتی کہانی میں اس کی منطقی/ جمالیاتی دلیل موجود ہے، اس لیے مجھے کہانی کو اس طرح وائنڈ اَپ کرنا پڑا۔ بہ خدا میں معتقدات پر حرف زنی کرنا نہیں چاہتا۔

آپ کو شنکر پاروتی کی (دو یا تین ہزار سال قدیم) شبیہ، 'لِنگم اور یونی' کی علامت یاد ہوگی، یہ تخلیق جاری رکھنے والے انسٹرومنٹس، یعنی reproductive organs ہیں جنھیں pagan ہندوستان ہزاروں سال سے پوجتا آیا ہے۔ دیکھیے کہ کہانی میں اِس مِلن کو کس طرح بیان کیا گیا ہے:

''کسی آخری نرتیہ (شنکر کا تانڈو ناچ) کے پچھواڑے، جہاں کچھ نہیں بچا تھا، زانیوں چنڈالوں کا رستہ روکے ہوئے ایک نئی اور بے خوف زندگی سر اُٹھا رہی تھی۔۔۔ دنیا بھر کے مسلے مسلائے، پٹے ہوئے، یہ دَلت پرش اور استری [Of course, they are now man & wife] مِلن کرتے تھے۔ ان کی دھمنیوں (یعنی سانسوں) میں گر یجا پتی مہیشور کے شوکت وجلال کا ڈمرو بجتا تھا۔''

7۔ ندی اور آدمی

عزیزم! پہلے اس کہانی 'ندی اور آدمی' کے بارے میں کچھ وضاحت:

کہانی کے عنوان اور بیانیے میں جس 'ندی' کو ہائی لائٹ کیا گیا ہے، وہ جنوبی بہار کی چھوٹی سی

ندی کرم ناسا ہے۔

ہندوستان کے نقشے پر نظر ڈالیے تو ہمالیہ سے نکل، خلیجِ بنگال کی طرف بہتی، گنگا ندی، پہلے مشہور شہر الہ آباد پہ جمنا سے جا ملتی ہے، پھر اپنی رَو میں، آگے چل پڑتی ہے۔ صوبہ بہار کے صدر مقام، پٹنہ تک پہنچنے سے پیشتر ہمالیہ سے اُترتی دو چھوٹی معاون ندیاں، گھاگرا اور گنڈک، گنگا میں یکے بعد دیگرے اُترتی ہیں۔ ندیوں کا یہ ملن، ظاہر ہے، گنگا کے شمالی کنارے پر ہوتا ہے۔ تو اِس جگہ کے عین مقابل، جنوب کے بطن سے ایک (بلکہ دو) مسکین سی ندیاں، کرم ناسا اور سون، نقشے کے جنوب مغرب کی طرف بہتی دکھائی دیں گی۔ مگر اِن کو بہت غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے، عظیم دریاؤں گنگا، جمنا اور دوسری صف کی ندیوں گنڈک اور گھاگرا کے آگے ان ندیوں کی، کسی بھی نقشے پر، بساط ہی کیا ہو گی (سون ندی سے اس وقت ہمیں کوئی لینا دینا نہیں ہے)۔

اِس کرموں والی، کرم ناسا کو شیر شاہ کے والد میاں حسن خان سوری کی وجہ سے اور پھر خود فرید خان شیر شاہ کی وجہ سے اصل اہمیت حاصل ہوئی۔ میاں حسن کو کرم ناسا کے اُوپر لی طرف والی زمین کا ایک ٹکڑا (جہاں اب شیر سہسرام اور شیر شاہ کا مزار ہے) فوجی اِقطاع کی طور پر عطا ہوا تھا۔ یہ اقطاع میاں حسن کے بعد شیر شاہ کے پاس آئی۔ پشاور یونی ورسٹی، شعبۂ تاریخ کے صدر نشین، (مرحوم) ڈاکٹر حسین خان کی ریسرچ کے مطابق، یہ فوجی اقطاع، شمال مغرب سے جنوب مشرق سمتوں میں پھیلی تھی اور اس کی ڈیوائڈ نگ لائن یہی اپنی کرم ناسا ندی تھی۔ ہمایوں اور شیر شاہ کی آویزش میں اِس ندی کا دلچسپ 'کردار' رہا ہے۔ ایک بار جب ہمایوں اپنی دانست میں جنوبی کنارے پر شیر شاہ کا رستہ روکے بیٹھا تھا، اوپر کہیں مون سون فنا مینن کے طفیل، ندی میں راتوں رات باڑھ آ گئی۔ ہمایوں کا کیمپ جل تھل ہو گیا۔ اِدھر یہ پانی سے بچنے کے جتن کرتے رہے، اُدھر شیر شاہ، ندی کے خشک کنارے پر سے کوئی اسٹریٹیجک موو کرتا، ہٹا اور ندی اُلانگھتا ہوا، ہمایوں کے جنوبی پہلو پر دَبش کرنے آن بیٹھا۔ سبحان اللہ!

شیر شاہ نے اپنی بلوغیت کے اہم سال کرم ناسا کے قرب میں اور صدر جہاں، حسن علی خان کے ساتھ اور اوجینی راجپوتوں کی رفاقت میں گزارے ہیں، تو میں نے اِس کہانی کی بُنت میں اِن سبھی کو شریک رکھا ہے۔ نارنگ دیو وِکرم اوجینی راجپوت ہے۔ شنا ور غلزئی فکشن کی دَین ہے۔

ولایتِ پنجاب کا حاکم ہیبت خان نیازی لاہور میں سُوری مملکت کا نمائندہ تھا۔ علاقہ روہ میں ڈیرہ اسمٰعیل خان، پشاور، کوہاٹ سب شامل تھا۔ [اور یقیناً (موجودہ) فاٹا کا پورا علاقہ بھی روہ کہلاتا تھا]

(شیر شاہ کا دادا ابراہیم خان سوری، اپنے بیٹے میاں حسن خان کو ساتھ لے کر ڈی آئی خان سے ہند 'ہجرت' کر گیا تھا)

یہ دیکھیے کہ پشاور سے نیچے [سندھ دریا کو باؤنڈری لائن بناتے ہوئے] علاقہ بھکر تک، پھر جہلم دریا کے مغربی کنارے سے، سندھ دریا کے مشرقی ساحل تک اور اوپر رُہتاس (وہ جو پاکستان میں ہے) سے گھوم کر ہمالیہ کے سلسلۂ کوہ کے متوازی چلتے ہوئے — ایک دم ملک بنگالے تک، پھر وہاں سے رُہتاس (وہ جو ہندوستان میں ہے) اور کالنجر اور پھر جناب! دریائے نربدا پار کرتے ہوئے، ملک خاندیش کا پورا علاقہ — یہ سب سوری مملکت میں شامل تھا۔ اللہ غنی!

اور اِن سب فتوحات و کرامات کا سلسلہ، ایک غریب سی (لیکن تیکھے مزاج کی) ندی کرم ناسا کے جغرافیائی محلِ وقوع سے شروع ہوا تھا، تو مجھ کہانی سنانے والے ام خ نے اپنا پریروگیٹو استعمال کرتے ہوئے، اِس ندی کو ایک شخصیت اور موونگ فورس کی طرح دکھایا دکھانے کی کوشش کی ہے۔ باقی آپ قاری/اسکالر جانیں — جیسا بھی ہے، یہی اور اتنا ہی ہے۔

عزیزم! میری شیر شاہ فکشن کو اگر کوئی کریڈٹ جاتا ہے تو اُس کا کچھ حصہ ایک محقق اور عالم ڈاکٹر حسین خان (مرحوم) کو جانا چاہیے۔ وہ اس طرح کہ سُور انٹرریگنم کے سلسلے میں، میں اپنی کم آگہی یا سمجھیے خوش فہمی میں مگن رہتا تھا کہ بھائی، میں نے ایشوری پرشاد سے اور (کلکتہ یونی ورسٹی کے اسکالر) قانون گو صاحب کی ریسرچ سے کسبِ فیض کیا ہے اور یہ کہ میرا ممدوح واقعی گریٹ سلطان تھا، اور بس۔ مگر جب معلوم ہوا کہ شمس آباد (ضلع اٹک) میں سنہ 1929ء میں پیدا ہونے والے ایک کمٹیڈ اسکالر نے ساری عمر اِس ایک موضوع پر بے تھکے کام کیا ہے اور 1987ء میں انگریزی میں ایک کتاب ''اُستادِ بادشاہاں عرف شیر شاہ سوری'' لکھ دی ہے، اور یہ کہ مصنف، حسین خان کو خدا خوش رکھے، انھوں نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے؛ تو یہ سمجھیے کہ یہ عاجز کِھل اُٹھا۔ میرے دوست حسن ہاشمی نے مجھے وہ کتاب عطا کی اور میں نے دو سال اس کتاب کے ساتھ گزارے۔ معلوم ہوا یہ وہ تصنیف ہے

جس سے میری کہانیوں میں ایک جرنیلی سڑک بچھ گئی ہے، جو سایہ دار ہے اور خوب روشن بھی، اور اس میں کہیں کوئی شک شبہ نہیں!

اسد محمد خاں کے اعزازات

تمغۂ امتیاز 2009

عالمی فروغِ اُردو ادب ایوارڈ، دوحہ (قطر) 2007

شیخ ایاز ایوارڈ برائے ادب 2007

احمدندیم قاسمی ایوارڈ برائے فکشن 2004

کہانی شروع ہوتی ہے۔ مرکزی کردار، ایک آشیاں گُم کردہ آدمی، لاموجود کے سامنے ہے۔ کہانی کے دوسرے ٹکڑے میں ایک گُم کردہ آشیاں اُس کے سامنے ہے۔ کہانی کا تیسرا ٹکڑا اُسے اپنے ہی جیسے آشیاں گُم کردوں کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے جن میں وہ بھی ہیں جو اُسی کے آشیاں کے رہنے والے تھے اور وہ بھی جو اور آسمانوں تلے اپنے آشیاں رکھتے تھے۔ کہانی جاری ہے...

بابا نانک ایک گاؤں گئے۔ وہاں کے لوگوں نے اُن کی اور اُن کے چیلوں کی خوب آؤ بھگت کی۔ رخصت ہونے لگے تو انھوں نے گاؤں کے باسیوں کو اُجڑتے رہنے کی دُعا دی۔ اسی طرح ایک دوسرے گاؤں کے لوگوں کو، جنھوں نے بابا اور اُن کے بھگتوں کے ساتھ خاصی رکھائی دکھائی، وہیں بستے رہنے کی دُعا دی۔ چیلوں کے استفسار پر بابا نے کہا کہ پہلے گاؤں کے لوگ جہاں جائیں گے خوشیاں پھیلائیں گے تو میں نے انھیں اُجڑنے کی دُعا دی۔ اور دوسرے گاؤں کے لوگ؟ قاری سمجھ ہی سکتے ہیں۔

تو اسد محمد خاں اس روایت کے پہلے گاؤں کے باسی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ خوشیاں تو پھیلاتے ہی ہیں، کہانیاں بھی سناتے ہیں — کبھی مکمل تو کبھی ٹکڑوں میں۔

فکشن
ISBN 978-969-9473-42-5
9 789699 473425 >
www.readings.com.pk
القا پبلیکیشنز
ریڈنگز کا اشاعتی ادارہ
Rs. 195